عربوں کا اُصولِ تربیت

ذیل میں عرب فلاسفہ و ادبا کے ہم وہ خیالات درج کرتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ عرب بچّوں کی تعلیم تربیت اور تہذیب کا کیا اصول رکھتے تھے؟ ہم صرف واقعات درج کرتے ہیں۔ فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

احنف اور معاویہ

احنف بن قیس ایک مرتبہ امیر معاویہ کے پاس آئے۔ یزید ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ باپ بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ معاویہ نے احنف سے پوچھا "اے ابا بحر بچّوں کے بارے میں تمھاری رائے کیا ہے؟" احنف نے جواب دیا "اے امیرالمومنین بچّے، ہمارے ستون ہیں، جن سے ہماری پیٹھ سہارا لیتی ہے۔ وُہ ہمارے دِلوں کے مرغوب پھل ہیں۔ وہ ہماری آنکھ کی ٹھنڈک ہیں۔ انہی کو لے کر ہم دشمنوں پر حملہ کرتے ہیں، وہی ہمارے بعد ہماری جگہ لیتے ہیں۔ پس تجھے چاہیئے کہ بچّوں کے لئے نرم و ملائم زمین بن جا۔ ان کے لئے شفقت کا سایہ کرنے والا آسمان بن جا۔ اگر وہ تجھ سے مانگیں تو انہیں دے۔ وہ تیری رضاجوئی کے خواہاں ہیں۔ تو

ان سے خوش رہ۔ انہیں اپنی محبت سے محروم نہ رکھ ورنہ وہ تیرے قرب سے بھڑکیں گے۔ تیری زندگی سے کھٹکیں گے اور تیری موت کی آرزو کریں گے!" معاویہ نے کہا۔" واہ ابابحر، خوب گفتی! واقعی لڑکوں کی وہی فطرت ہے جو تم نے بیان کی!"

امام غزالی، اپنی کتاب ' احیاءالعلوم ' (ج ۳ ص ۱۵۲ عنوان ' اخلاق کی تہذیب اور نفس کی ریاضت) میں مشورہ دیتے ہوئے کہ بچوں کے احوال و مزاج کے مطابق کیا کرنا چاہیئے۔ اور ان سے کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور ان کا مزاج کیونکر پہچاننا چاہیئے؟ لکھتے ہیں:-

"اگر ایک طبیب تمام بیماروں کا ایک ہی نسخہ لکھے، اور ایک ہی دوا سے علاج کرے۔ تو اکثر کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ بالکل یہی حال تربیت دہندہ کا ہے، اگر وہ اپنے زیرِ تربیت لڑکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا تو انہیں ہلاک کردے گا، اور ان کے قلوب پر موت طاری کردے گا۔ تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ اپنے زیر تربیت لڑکوں میں سے ہر ایک کے حال، عمر اور مزاج کے مطابق ان کے لئے راستہ تجویز کرے اور ان کے لئے وہی ریاضت تجویز کرے، جس کے وہ متحمل ہوسکیں!"

امام غزالی کا قول | بالکل یہی بات آج کل کے ماہرین

علم النفس اور تربیت و تعلیم بھی لکھتے ہیں - امام غزالی اپنی مذکورہ کتاب میں آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"یاد رکھنا چاہیئے - صبیان کی تربیت سب سے اہم اور کٹھن معاملہ ہے - بچہ اپنے والدین کے پاس ایک امانت ہے - اگر اس کی صحیح تربیت و تعلیم ہو، تو اس کی نشوونما بھی درست ہوگی - اور اگر غلط تربیت و تعلیم ہوئی تو وہ ناکارہ بن جائے گا - بدبخت ثابت ہوگا، اور ہلاک ہو جائے گا - (اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو) تو ضروری ہے کہ اسے سزا پوشیدہ طور پر دی جائے - اور اس سے کہا جائے - خبردار، اب ایسی حرکت نہ کرنا کبھی - ہر وقت بچہ کو ڈانٹنا ڈپٹنا بھی نہیں چاہیئے - پھر وہ ملامت کا خوگر ہو جاتا ہے - اور بڑی حرکتوں کے صدور پر جری ہو جاتا ہے - اور بات کا ذرا بھی اثر نہیں لیتا - باپ کو چاہیئے کہ وہ بچہ کی نگہداشت سے کسی وقت غافل نہ ہو، اس پر اپنا رعب رکھے - ڈانٹ ڈپٹ کرے - لیکن کم (یہ بھی ضروری ہے کہ) اسے ورزش اور کھیلنے کا عادی بنائے - تاکہ وہ چست رہے - اور اس پر کسل و ماندگی غالب نہ آنے پائے - یہ بھی ضروری ہے - کہ جب وہ تعلیم گاہ سے واپس آئے تو

دے کھیلنے کا موقع دے۔ تاکہ وہ راحت
پائے اور مکتب کی ذہنی تھکن دُور ہوجائے
لیکن کھیل ایسا نہ ہو جو بہت زیادہ تھکادے
یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ماں باپ کی
اطاعت، معلّم اور مؤدّب کی اطاعت کا
عادی بنایا جائے اور ہر اس شخص کا احترام
کرنا سکھایا جائے، جو اس سے عمر میں بڑا
ہو یا اجنبی ہو!"

یہ وہ بہترین اُصول ہیں، جن کی پیروی، آج
یُورپ اور امریکہ کر رہے ہیں۔ اور نئے زمانہ کے
علمائے تربیت و علم النفس، انہی اصولوں کو اپنائے
ہوئے ہیں ؛

بچّہ اور خیر و شر

امام غزالی کی رائے میں۔ بچّہ
جب پیدا ہوتا ہے تو اس
میں خیر و شر کی یکساں صلاحیت ہوتی ہے۔ اور والدین
اُسے دونوں میں سے ایک کی طرف مائل کر دیتے
ہیں۔ رسول اللہ ؐ کا ارشاد ہے۔ "ہر بچّہ فطرت پر
پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی
یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یہی بات تعلیم و تربیت کے بارے
میں بھی ہے"

ابن خلدون[1] نے، اپنے مشہور مقدمہ میں (ص ۶۱۹)

---

[1] مشہور و یگانہ مورّخ اور کاتب۔ ولادت ۷۳۲ھ، وفات ۸۰۸ھ۔ اپنے مشہور مقدمہ میں تربیت و تعلیم سے متعلق بیش بہا خیالات ظاہر کئے ہیں ؛

ایک مستقل باب باندھا ہے۔ "بچوں پر سختی مضر ہوتی ہے!" اس باب میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"دورانِ تعلیم میں متعلّم کی مار پیٹ نامناسب ہے۔ خاص طور پر چھوٹی عمر کے بچوں پر تو بالکل سختی نہیں کرنی چاہیئے۔ جو شخص بچوں یا غلاموں یا خادموں سے قہر کا برتاؤ کرتا ہے وہ ان کے دِل کی خوشی چھین لیتا ہے، انہیں نکما بنا دیتا ہے۔ انہیں دروغ گو اور بد باطن کر دیتا ہے۔ وہ ایسی باتیں ظاہر کرنے لگتے ہیں جو ان کے ضمیر کے خلاف ہوتی ہیں۔ ایسا نہ کریں تو قہر کے شکار بنیں۔ وہ مکر اور دھوکے کے عادی ہو جاتے ہیں، کہ بغیر اس کے کام نہیں چل سکتا۔ پھر یہی اطوار، ان کی عادت اور خُلق بن جاتے ہیں —— پس معلّم کو چاہیئے کہ وہ اپنے شاگرد پر، باپ اپنے بیٹے پر قہر و استبداد کا مظاہرہ نہ کریں اور ان کی تربیت جور و ستم کے بل پر نہ کریں!"

ہارون رشید کا واقعہ

خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے امین کے معلّم سے اسے اس کی تربیت میں دیتے ہوئے کہا تھا :-

"اے احمر، خلیفۂ وقت نے تجھے اپنی سب سے قیمتی پونجی، اپنے دِل کے چین و آرام

کو تجھے سونپا ہے۔ لہٰذا اپنی شفقت کا ہاتھ اس پر دراز رکھ، اسے قرآن پڑھا۔ تاریخ کے واقعات سُنا، اشعار یاد کرا، سنّتِ نبویؐ سے آشنا کر۔ اس میں بصیرت پیدا کر تاکہ وہ اچھے کلام کو پرکھ سکے۔ اسے ہنسنے سے سوا خاص اوقات کے منع کر۔ اسے تعلیم دے کہ جب بنوہاشم اس کے پاس آئیں تو ان کا احترام کرے۔ اس کے ساتھ کوئی بھی ایسی ساعت نہ گزار، جو اس کے لئے سودمند نہ ہو۔ لیکن اسے رنجیدہ نہ کر کہ اس کا ذہن مرجائے۔ اس کی غلطیوں کو نظرانداز نہ کر ورنہ وہ ان کا عادی ہوجائے گا۔ نرمی اور ملاطفت سے اسے راہ راست پر لا۔ اگر وہ تیرا کہا نہ مانے تو سختی کر۔"[1]

طوالت کے اندیشہ سے ہم صرف انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ ادبِ عربی اس قسم کے واقعات و امثلہ سے بھرا پڑا ہے۔ جو کچھ ہم نے اوپر کی سطروں میں پیش کیا، وہ کافی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس طرح کی مثالیں زیادہ معلوم کرے اسے چاہیئے کہ 'اغانی'۔ 'امالی'۔ 'کامل'۔ 'عقد الفرید'، 'زہر الآداب'، 'صبح الاعشی'۔ 'البیان'۔ 'والتبیین'۔ 'مقدمۂ ابنِ خلدون'۔ اور امام غزالی کی 'احیاء العلوم' کا مطالعہ کرے ✿

---

[1] 'مقدمۂ ابنِ خلدون'

۴۔ چوتھا مرحلہ، جوانی:۔ ۱۵ سے ۱۶ سال تک ۱۳ سے ۱۴ سال تک
یہ تمام مراحل جسمی، عقلی، اور خلقی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ہم ان پر الگ الگ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

پہلا مرحلہ پہلے مرحلہ کے دوران میں بچہ نمایاں طور پر نشو و نما حاصل کر لیتا ہے۔ یہ نشو و نما پہلے اور دُوسرے، پھر چھٹے اور ساتویں سال میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔ ولادت کے پہلے مہینوں میں بچہ ہاتھ پاؤں مارنا اچھی طرح سیکھ لیتا ہے۔ چھٹے مہینے اس میں بیٹھنے کی سکت آ جاتی ہے۔ دسویں مہینے کے بعد وہ گھسٹنے لگتا ہے۔ اور سال بھر کے بعد کچھ کچھ چل لیتا ہے۔ ولادت کے دُوسرے یا تیسرے روز وہ دیکھنے لگ جاتا ہے۔ ساتویں مہینے سے پہلے وہ ماں اور آیا، باپ اور چچا میں تمیز نہیں کر سکتا۔ پہلے سال میں اسے گوناگوں امراض کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جیسے دست، معدہ کی خرابی، ہڈیوں کی تری، چیچک، کھانسی وغیرہ کا زور بالعموم پانچویں، چھٹے سال میں ہوتا ہے۔

تین برس کی عمر تک بچہ کے ادراکات بالکل سطحی ہوتے ہیں۔ مثلاً پہلے سال میں وہ کبوتر اور فاختہ میں، مُرغ یا مرغی میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ اس پہلے مرحلہ میں صرف انہی چیزوں کا ادراک کر سکتا

کہ مدارسِ ابتدائیہ میں بچّوں کو ہم جو درس دیں، وہ ایسی چیزوں پر مبنی ہو، جو دیکھی جا سکیں، چھُوئی جا سکیں، سُنی جا سکیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے نمونوں اور تصویروں سے وضاحت کر کے ہم سمجھائیں۔ تجربہ کی کمی، اور عقل کی خامی کے باعث، اس مرحلہ میں بچّہ کی فکر مربوط نہیں ہوتی ؛

طفولیت کے پہلے دَور میں بچّہ کا آغاز کار کھیل سے ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں کوئی چیز آجائے گی تو خوشی خوشی اسے اپنی مُٹھیوں میں بھینچ لے گا، پھر پھینک دے گا۔ تیسرے سال وہ اس قابل ہو جاتا ہے۔ کہ دُوسروں کی نقل اُتار سکے۔ وہ اپنے چوبی گھوڑے یا گاڑی پر چڑھے گا، کھیلوں میں زیادہ مشغول رہے گا۔ خرید و فروخت سے دِل چسپی لے گا اور بچپن کے کھیلوں سے بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کرے گا، اور اُس سوسائٹی سے پُوری طرح متاثر ہوگا، جو اس کے گھر سے عبارت ہے۔ بچّہ جب تک تین سال کا نہ ہو جائے، تجارب اور حوادث کو یاد نہیں رکھ پاتا، بھُول جاتا ہے ؛

بچّہ کی رونے کی عادت ہے۔ لیکن کس حد تک ماں باپ کو اس کے رونے پر کان دھرنا چاہیئے ؟ وہ ایسا کھانا مانگتا ہے جو اس کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکر ممکن ہے کہ اس کی یہ ضد پُوری کر دی جائے ؟ وہ دُوسرے بچّوں کا کھیل چھیننا چاہتا ہے

یا دھار دار چیزوں سے ـــــ مثلاً چھری یا سوئی سے ـــــ کھیلنا چاہتا ہے ، یا ایسی چیزوں سے کھیلنا چاہتا ہے ، جو بڑی آسانی سے ٹوٹ سکتی ہیں جیسے گلاس اور پیالہ ، یا وہ ایسے کھیل کھیلنا چاہتا ہے جو مضر ہیں ، جیسے کتابوں اور کاپیوں کا پھاڑنا، ایسے مرحلوں پر سمجھدار تربیت دہندہ کا فرض ہے کہ وہ دانشمندی اور حکمت عملی سے کام لے ۔ نہ ہر کام کی کھلی چھٹی دے دے ۔ نہ ہر کام سے منع کر دے اس کا فیصلہ ترازو کے دو پلڑوں کی طرح برابر ہونا چاہیئے ۔ بے ضرر کھیل کی اجازت اور نامناسب کام کی ممانعت !

اس موقع پر ہم ایک بات اور بھی کہنا چاہتے ہیں ۔ بچّوں کے لئے یہ قطعًا ناممکن ہے کہ وہ اپنے کپڑے میلے نہ ہونے دیں ۔ کبھی کسی سے جھگڑا نہ کریں ۔ کبھی توڑ پھوڑ نہ کریں ۔ یا کوئی چیز ضائع نہ کریں ، انہیں کبھی چوٹ نہ لگے ۔ یا وہ زخمی نہ ہوں یہ سب باتیں ان سے سرزد ہوں گی اور ضرور ہوں گی لیکن ان کا علاج مارپیٹ ، ڈانٹ ڈپٹ یا جبر و قہر نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ہے ۔ کہ حکمت عملی سے انہیں اچھائی پر آمادہ کیا جائے ۔ اور بُرائی سے روکا جائے یاد رکھنا چاہیئے مار بالکل آخری دوا ہے ؛

بچّہ کا غصہ اس دَور میں بچّہ اپنا مطالبہ پورا کرانے کے لئے روتا ہے ۔ اگر اس کی بات

پوری کرنے میں دیر کی جائے تو اسے غصہ آ جاتا ہے۔ اور وہ رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی بات پوری کر دی جائے تو بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کی بات پوری کرنے میں اگر دیر کی جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا گیا۔ وہ اور کچھ نہیں جانتا، صرف یہ جانتا ہے کہ "میں نے مانگا، اور وہ نہیں ملا جو میں نے چاہا!" بس اب وہ رونے لگے گا۔ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ اس کی ماں اسے چاہتی نہیں، اسی لئے اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتی۔ ایک جاہل ماں، بچہ کے رونے کا مطلب صرف یہ سمجھتی ہے کہ وہ بھوکا ہے اور کھانا مانگ رہا ہے۔ حالانکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ بالکل بھوکا نہیں ہوتا، کھانے کا اسے خیال بھی نہیں ہوتا۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے بدل دیئے جائیں۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بچے اکثر تنگ کپڑے پہنتے ہیں۔ انہیں کس کے باندھ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے بس میں نہیں رہتا کہ ہاتھ پاؤں ہلا سکیں یا آسانی سے سانس لے سکیں۔ اسی طرح وہ زیادہ تر کھلی ہوا، اور دھوپ سے بھی محروم رکھے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس انگلستان میں بچہ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ خوب لمبے سانس لے ہلے ڈلے۔ اس کے کپڑے بڑے فراخ بنائے جاتے

ہیں، اسے باغوں میں لے جایا جاتا ہے۔ ایسے کمرے میں سُلایا جاتا ہے۔ جن کے روشن دان کھُلے ہوں۔ موسم سرما میں کبھی کبھی اسے کھُلی دُھوپ میں بالکل ننگا ڈال دیا جاتا ہے، تاکہ دُھوپ اور ہوا کھائے۔ اسے ایسے کھانے دیئے جاتے ہیں جو اس کی صحت کے لئے مفید ہوں، اسے توانا بنائیں۔ دن رات میں چار بار، مقررہ اوقات میں کھانا دیا جاتا ہے۔ وہاں بچہ کو صرف ماں کی محبت پر نہیں چھوڑ دیا جاتا، بلکہ ان کی حرکات و سکنات کا پُورا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بچوں کی اموات کی شرح بہت کم ہے۔

مشاہدات اور تجارب

ضروری ہے کہ ہم بچوں کی تربیت و تعلیم کے سلسلہ میں پُرانی روایات کے بندھنوں کو توڑ دیں۔ مشاہدات اور تجارب نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہ روایات مضر ہیں۔ ان سے فائدہ نہیں پہنچتا۔ نقصان شدید پہنچ جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ بچوں کی تربیت و تعلیم میں، کھلانے پلانے میں، پہنانے اوڑھانے میں، ان علمی اصولوں سے پُورا فائدہ اُٹھایا جائے جو ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہیں۔ دھوپ، ہوا اور روشنی سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا جائے۔ امراض سے بچنے اور محفوظ رہنے کے طریقوں پر سختی سے عمل کیا جائے

پرہیز، علاج سے بہتر ہے۔ یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے۔
بچہ خیالی قصوں اور کہانیوں کا شائق رہتا ہے
بعض علمائے تربیت کا خیال ہے۔ بچہ کو ان کا عادی نہ بنانا چاہئے۔ بلکہ عالمِ حقیقی کی کہانیاں سُنانی چاہئیں۔ تاکہ بچہ خیالی دُنیا میں نہ رہے۔ عملی دُنیا کو دیکھے اور سمجھے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بچوں کو عالمِ خیال کی دلچسپیاں بھی خاصا فائدہ پہنچاتی ہیں۔

بچہ، اپنے آپ کو بہت چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اپنے چھوٹے بھائی کے کھیل چھین لے۔ ماں، باپ صرف اسی کو چاہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دُوسرے کا خیال ہی نہیں کرتا۔ تربیت دہندوں کو چاہئے کہ بچوں کے ساتھ کامل عدل اور مساوات کا برتاؤ کریں۔

دُوسرا مرحلہ

دُوسرا مرحلہ، بچہ کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا سیکھے۔ تھوڑا بہت حساب بھی وہ سیکھ لیتا ہے۔ بہت سی باتیں، اقوال اور آیتیں وہ زبانی یاد کر لینے کی صلاحیت بھی پیدا کر لیتا ہے۔ اشعار، نظمیں بھی کچھ کچھ یاد ہو جاتی ہیں۔ اب اس کا حافظہ استحکام حاصل کرنے لگتا ہے۔ وہ بیک وقت، دو زبانیں سیکھ سکتا ہے۔

اب، بچہ میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی فکر کو کسی درجہ میں منظم کر لے۔ دو واقعات کے

اسباب و علل کی چھان بین کرنے لگتا ہے ۔ لیکن اس مرحلہ پر بچّہ کے ذہن و دماغ پر اتنا بوجھ نہ ڈال دینا چاہیئے، کہ وہ سہہ نہ سکے ۔

کھیل کُود میں بچّہ سیر و شکار کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔ مچھلی کے شکار سے بھی اُسے رغبت ہوتی ہے گیند کھیلنے، اور دوڑنے سے بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اب لڑکا سخت کاموں کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور لڑکی سینے پرونے سے دلچسپی لینے لگتی ہے ۔

اس مرحلہ میں، بچّوں کو مبادی زبان کی تعلیم دی جا سکتی ہے ۔ کہ وہ آسان زبان میں لکھ سکے، پڑھ سکے بات چیت کر سکے ۔ مبادی حساب و جغرافیہ و تاریخ کی بھی تعلیم دی جاسکتی ہے ۔ نقاشی اور ہاتھ سے کرنے والے کاموں پر بھی مائل کیا جا سکتا ہے ۔

اس مرحلہ میں جسمی امراض، پہلے مرحلہ کے مقابلہ میں کم حملہ آور ہوتے ہیں ۔ اور اگر ورزش، بوائے اسکاؤٹ، اکسکرشن وغیرہ کا سلسلہ جاری رہے تو بدن بہت زیادہ مضبوط اور توانا ہو جاتا ہے ۔

تیسرا مرحلہ عنفوانِ شباب کے مرحلہ میں بچّے ابتدائی مدارس کا کورس پُورا کر کے ثانوی مدارس کا رُخ کرتے ہیں ۔ اس دَور میں ان کے اجسام تیزی کے ساتھ بڑھنے لگتے ہیں ۔ جنسی خواہش بھی پیدا ہونے لگتی ہے ۔ اس دَور میں بچّوں کا نمو، مختلف ہوتا ہے بچّے، اپنے آباؤ اجداد سے، کشیدہ قامتی یا پستہ قدی ورثہ

ہیں پاتے ہیں ۔ اس دَور میں ان کے اعضا اور حرکات و سکنات میں ایک اضطراب سا پایا جاتا ہے یہ اضطراب نتیجہ ہوتا ہے اضطراب اعصاب کا ۔ اس دَور میں ذکاوت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے ۔ خیال آفرینی بڑھ جاتی ہے ۔ اُمنگیں مچلنے لگتی ہیں ۔ بڑے لوگوں اور فن کاروں کی طرف رغبت بڑھ جاتی ہے ۔ اس دَور میں لڑکا پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے ۔ بشرطیکہ تربیت دہندہ طریقہ اور سلیقہ سے کام لے ۔ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتا ہے ۔ ایسی شخصیت سمجھنے لگتا ہے جس کے بارے میں سوچا جانا چاہیئے ۔ جس کا ارادہ پُورا ہی ہونا چاہیئے ۔ جس کی عزّت ہونی ہی چاہیئے ۔

چوتھا مرحلہ | یہ جوانی کا مرحلہ ہے !

اس مرحلۂ شباب میں خاص توجّہ کی ضرورت ہے ۔ اس مرحلہ پر باپ کا فرض ہے کہ وہ بیٹے کی ، اور ماں کا فرض ہے کہ وہ بیٹی کی بہت صحیح رہنمائی کرے ۔ نوجوان لڑکے یا لڑکی کو کثرت سے وہ صحیح اور مستند کتابیں پڑھنے کے لئے دینی چاہئیں جن سے وہ صحیح فائدہ اُٹھا سکے ، گمراہی سے بچ سکے ۔ جوان مردوں اور عورتوں کا یہ دَورِ حیات بہت خطرناک ہوتا ہے ۔ اس زمانے میں لڑکے ، اور لڑکی کو ایسے کاموں میں منہمک رکھنا چاہیئے جو اسے بہکنے نہ دیں ۔ لڑکے کو ہاکی ، فٹ بال ، تیراکی ، کشتی اور دُوسری ورزشوں نیز مطالعۂ کتب اور تحریر و تقریر کی طرف متوجّہ

رکھنا چاہیئے ۔ اور لڑکی کو موسیقی ، نقاشی ، تصویر کشی مطالعۂ کتب اور دُوسرے اچھے کاموں میں لگا رکھنا چاہیئے ۔ تاکہ اس کا وقت صحیح طور پر کٹ سکے ۔ اور وہ غلط راستے پر نہ جا سکے ۔

ممیزاتِ وجدانیہ وعقلیہ

قدیم علما کا خیال تھا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ملکاتِ عقلیہ عطا فرمائے ہیں ۔ اور یہ ملکات مراحلِ نمو میں سے ہر مرحلہ پر نمایاں ہوتے رہتے ہیں ۔ اور یہ کہ ان ملکات کا ایک مستقل مرکز دماغ کے اندر موجود ہے ۔

لیکن جدید علم النفس نے ملکات کے اس نظریہ کو باطل کر دیا ہے ۔ اور یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ عقلی نمو کے لئے انسان مجبور "عمل" ہے ۔ ذیل میں ہم ، مراحلِ بلوغ میں سے چند کا تذکرہ کرتے ہیں :-

۱ ۔ اس مرحلہ میں اکثر طلبہ رٹنے پر سمجھنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ شعر اور خیالی باتوں پر زیادہ متوجہ ہوتے ہیں ۔ مضمون لکھنے اور شعر کہنے کی صلاحیت بھی ان میں پیدا ہو جاتی ہے ۔

۲ ۔ اجتماعی رُوح بیدار ہو جاتی ہے ۔ دُوسروں کے ساتھ تعاون کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اندھی تقلید سے طبیعت نفور ہو جاتی ہے ۔ اور حکم داری کا شوق پیدا ہونے لگتا ہے ۔

۳۔ زندگی سے سبق حاصل کرنے ، اور تجارب سے فائدہ اُٹھانے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ۔

۴۔ اس مرحلہ میں ایک خاص قسم کا چونچال پن پیدا ہو جاتا ہے ۔

۵۔ اطاعت سے طبیعت بھاگتی ہے ۔ حکومت کا شوق پیدا ہوتا ہے ۔

۶۔ مختلف قسم کی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں ۔ کبھی شرم و حیا غالب ہوتی ہے ۔ کبھی شجاعت و تہور کا غلبہ ہوتا ہے ۔ کبھی بُزدلی کارفرما ہوتی ہے ۔

۷۔ اضطراب وجدان کی وجہ سے اضطرابِ فکر بھی پیدا ہو جاتا ہے ۔ رجحانات مختلف ہو جاتے ہیں گھر میں کچھ اور جی چاہتا ہے ، مدرسہ میں کچھ اور کیفیت ہوتی ہے ۔

۸۔ علومِ طبعی ، تصویر کشی ، نقاشی ، موسیقی ، شعر ، فلسفہ مذہب سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے ۔ نفس کو راہ راست پر لانے کا یہ بہترین زمانہ ہے ۔ بڑے لوگوں کے قدم بہ قدم چلنے اور ان جیسا بننے کی تمنا سر اُٹھاتی ہے ۔

بچّوں کی انفرادیت

تعلیمی معاملات میں اختلافِ فردیت کا لحاظ

جدید علم النفس ایک عرصہ کے تجارب، اور بحث و گفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہ ہر انسان کی عقل یکساں نہیں ہوتی۔ بہت سے عقلی امتحانات سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک ہی عمر کے بچّوں کی عقل میں تفاوت ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک ہی قوم اور جنس سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں، خواہ ان کا خاندان بھی ایک کیوں نہ ہو۔ یہ عقلی تفاوت دو سگے بھائیوں تک میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ اختلاف صرف تکوینِ عقلی اور ذکائے طبعی ہی میں نہیں ہوتا بلکہ رغبت اور رجحان میں بھی ہوتا ہے۔ جس طرح ادراک، تخیّل، تصوّر، اور یادداشت میں اختلاف ہوتا ہے اسی طرح طریقِ فکر اور قوّتِ جسمیہ و عقلیہ میں بھی ہوتا ہے۔

بچّہ اور سبق ہر مدرّس کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ کوئی سبق بھی تمام طلبہ کے لئے یکساں مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ان کی عقلی قوّت یکساں نہیں ہے۔ علمائے نفس کا خیال ہے کہ معلّم کو درس دیتے وقت اِس فرق کو

ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے عمل میں کامیاب ہو۔ اس کا فرض ہے کہ تلمیذ کو اُتنا ہی بتائے اور سکھائے، جو اس کی ذہنی و عقلی استعداد کے مطابق ہو۔ مدرّس کی کامیابی یا ناکامی صرف اسی بات پر منحصر ہے۔ اور وہ مدرّس، مدرّس کہلانے کا مستحق نہیں۔ جو بچّوں کی طبیعت اور جبلّت سے آشنا نہ ہو۔ افراد کے درمیان، اوصافِ خلقی کا بہت شدید اختلاف ہے اور اس اختلاف کو کسی وقت بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ ہر فرد ایک ایسی انفرادیت رکھتا ہے، جو اسے دُوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔ ہر دس لاکھ کی تعداد میں دو آدمی بھی مشکل سے ایسے ملیں گے جن کی عقلی، ذہنی اور جسمانی صلاحیت و قوّت بالکل یکساں ہو۔ لہٰذا ثابت ہوا، افراد کے درمیان قوّتِ عقل و فہم کا زبردست اختلاف ہے۔ افراد کا اختلاف زیادہ نمایاں ان تین صورتوں میں ہوا کرتا ہے:

۱۔ اخلاق
۲۔ قوّتِ عقلی
۳۔ میل و رغبت

مختلف بچّے چنانچہ اکثر یہ بات مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔ کہ ایک بچّہ ایک کتاب تین مہینہ میں ختم کرلیتا ہے، اور دُوسرا بچّہ اسی کتاب کے ختم کرنے میں پُورا سال لگا دیتا ہے۔ امریکہ کے بعض مدارس نے اس بات کی تحقیق کے بعد اندازہ لگایا

ہے کہ ذہین طالب علم جو کام دو دن میں کر سکتا ہے وہی کام ایک کند ذہن طالب علم ۱۶ دن میں بھی نہیں کر سکتا۔[1] چنانچہ ثورندیک[2] کا قول ہے:۔ "ہم نے ایسے بچے بھی دیکھے۔ جن کی عمر ۶ سال ہے۔ اور وہ ایسے عقلی کام کر لیتے ہیں۔ جو دس برس کے بچے بھی نہیں کر سکتے"

یہ ذوق مدرسہ کی زندگی کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ خارجی موثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً گھر، سوسائٹی، اور وراثت !!

ایک علامہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد۔ علمائے علم النفس اس فیصلہ پر پہنچے ہیں۔ کہ خوش مزاجی، بدخلقی ہنسی کی قدرت، موسیقی سے رغبت، دو ٹوک فیصلہ کرنے کی اہلیت، عہد کی پابندی، مسرت و غم۔ یہ تمام باتیں زیادہ تر موروثی ہوتی ہیں۔ ان چیزوں کی تعمیر میں گھر کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ضعفِ عقلی کند ذہنی، بدیہہ گوئی، قوتِ حافظہ کی مضبوطی یا کمزوری ذہانت اور اس طرح کے دوسرے صفاتِ عقلیہ بھی

---

[1] ملاحظہ ہو:۔ Burk's tow years in Individual Instruction, California State normal San Francisco

[2] (ثورندیک Throndike امریکہ کا مشہور ماہر علم النفس۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب:۔ Educational Psychology, Vol. 3 and IndividualityRiver side Monograph, by Throndike

زیادہ تر موروثی ہوتے ہیں - ان کی تعمیر میں بھی گھر کا بڑا حصّہ ہے ٭

مدرّسین اور معلّمین ایک بہت بڑی غلطی یہ بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہین اور کند ذہن طلبہ میں امتیازِ درس نہیں ملحوظ رکھتے - حالانکہ بہت ضروری ہے کہ پڑھاتے وقت ان فروق کو پُورے طور پر ملحوظ رکھا جائے - اور بچّہ کو وہی دِیا جائے، جسے وہ لے سکے اور بآسانی ہضم کر سکے ٭

بچّہ کا عقلی امتحان

فرانس کے مشہور عالم الفریڈ بینٹ[1] نے اپنی کتاب "بچوں کے بارے میں جدید آرا"[2] میں بچوں کے عقلی امتحان کا ایک چارٹ درج کیا ہے۔ تھوڑے سے تصرّف کے ساتھ ہم اس کے بعض حصص درج ذیل کرتے ہیں :-

بچّہ کی عمر	امتحان
۳ ماہ :-	جو سامنے آئے اسے دیکھنا۔
۹ ماہ :-	(۱) جو آواز کان میں آئے اس کی طرف توجہ (۲) کسی چیز کو دیکھ کر اسے پکڑنا یا اس کی طرف ہاتھ بڑھانا۔
پہلا سال :-	کھانے کی مختلف قسموں میں تمیز کرنا۔
دو سال :-	(۱) چلنا سیکھ لے (۲) جن چیزوں کی ضرورت ہو انھیں بیان کرسکے (۳) جو کہو سمجھ لے۔

---

[1] (Alfred Binet) فرانس کا مشہور عالمِ نفسیات جس نے اس فن پر متعدّد تحقیقی کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس کی کتاب "عقلی امتحانات" بہت مشہور ہے۔

[2] Les Idees Modernes Sur les Infantis

بچّہ کی عمر	امتحان
تین سال :-	(۱) اپنی ناک، آنکھ اور مُنہ کو پہچان سکے
	(۲) اپنا نام اور لقب سمجھ سکے۔
	(۳) سماعت کے بعد چھوٹے چھوٹے جُملے دُوہرا سکے۔
	(۴) ہم شبیہہ صورتوں کو دیکھ سکے۔
چار سال :-	(۱) اپنی جنس، یعنی مذکّر، مونّث پہچان سکے۔
	(۲) مندرجہ ذیل اشیا کے نام یاد رکھ سکے مثلاً کنگھی، چھری، پیسہ، یہ نام پوچھنے پر بتا سکے
	(۳) تین عدد تک کے ہندسے سُن کر یاد کر سکے
	(۴) دو خطوں میں امتیاز کر سکے کہ ان میں کون بڑا اور کون چھوٹا ہے؟
پانچ سال :-	(۱) دو مختلف وزن کے صندوقوں کا اندازہ کر کے بتا سکے ہلکا کون ہے، بھاری کون؟
	(۲) مربّع کی شکل سامنے رکھ کر نقل کر سکے۔
	(۳) دس ٹکڑوں تک کا جُملہ سُن کر دوہرا سکے
	(۴) چار پیسے اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں، تو ایک ایک کر کے گِن سکے
	(۵) آسان کھیل، کھیل سکے چھوٹے چھوٹے

بچّہ کی عمر	امتحان
	تکوینی کام کر سکے ، پھر انہیں توڑ دے ، یا پھینک دے اور دوبارہ ویسے ہی بنانے پر زور دے ۔
چھ سال :-	(۱) داہنے اور بائیں ہاتھ کی تمیز کر سکے ۔
	(۲) سولہ ٹکڑوں تک کا جُملہ سُن کر دوہرا سکے
	(۳) دو مختلف صورتوں کو یاد رکھ سکے ، اور یہ یاد رکھ سکے ان میں خوبصورت کون تھا ؟
	(۴) ہر وقت کے برتنے کی بعض چیزوں کی تعریف کر سکے ۔
	(۵) جو کام بتایا جائے اُسے کر سکے ۔
	(۶) اپنی عمر بتا سکے ۔
	(۷) صبح و شام کی تمیز کر سکے ۔
سات سال :-	(۱) جو صورت دِکھائی جائے اس کے نقائص کی طرف اشارہ کر سکے ۔
	(۲) متوازی اضلاع کی شکل، نقل کر سکے.
	(۳) لکھی ہوئی عبارت کاٹ سکے ۔
	(۴) پانچ حسابی ہندسے سُن کر دوہرا سکے۔
	(۵) جو صورتیں سامنے ہوں ، ان کا وصف بیان کر سکے ۔
	(۶) سکوں کی قیمت پہچان سکے ۔
	(۷) نقود میں سے چار مختلف انواع کو یاد

بچہ کی عمر	امتحان
	(۳) جو دو جملے اسے بتائے جائیں انہیں اپنی عبارت میں لکھ سکے۔
	(۴) پانچ سوالات تک کا جواب آسانی دے سکے۔
	(۵) حافظہ کی مدد سے مختلف شکلیں بنا سکے۔
بارہ سال :-	(۱) ایسی عبارتوں پر جو خلافِ عقل ہوں، نقد و تبصرہ کر سکے۔
	(۲) تین جملوں کو ایک عبارت میں استعمال کر سکے۔
	(۳) تین منٹ میں بہت سے جملے یاد کر لے۔
	(۴) کلماتِ معتوبہ مثلاً صدقہ، عدالت، اور شفقت کا مطلب و مفہوم سمجھ سکے۔
	(۵) کسی جملہ کی ترتیب بگاڑ دی جائے تو وہ اسے ازسرِ نو ٹھیک کر سکے۔
پندرہ سال :-	(۱) سات حسابی ہندسے، سُننے کے بعد دوہرا سکے۔
	(۲) ۲۰ - ۲۵ ٹکڑوں تک کے جملے، سُننے کے بعد، دوہرا سکے۔
	(۳) جو صورتیں اس کے سامنے پیش کی

جائیں ان کی تفصیل بیان کر سکے۔
(۴) جس وزن کا کلہ اس کے سامنے رکھا جائے، اس کے تین الفاظ یاد رکھ سکے۔

یہ ہے وہ عام امتحانی معیار جس سے لڑکوں کی ذہانت اور ذہانت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ امتحانات جو اوپر درج کئے گئے ہیں۔ یہ بجائے خود کافی ہیں۔ لیکن سمجھدار مدرّس، بچّہ کی عمر، سوسائٹی اور گھر کو پیشِ نظر رکھ کر خود بھی بہت سے امتحانات اس سلسلہ میں وضع کر سکتا ہے۔ اور خود نئے نئے اصول تراش سکتا ہے[1]

اگر مدرّس چاہے، تو اس سلسلہ میں، حسب ذیل کتابیں بھی پیشِ نظر رکھ سکتا ہے۔

(۱) "عقلی امتحانات" Mental Tests, by P.B. Ballard.

(۲) ذہانت کا پیمانہ، The Measurment of Intelligence, by Terman.

اگر مدرّس چاہے تو ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد، وہ خود سوچ سمجھ کر ان میں تغیّر اور زیادتی کر سکتا ہے۔ بعض امتحانات میں تقدیم و تاخیر بھی کر سکتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو

The Teachers, Encyclopaedia Vol. I. p. 15.

اچھی ہے، وہ بکر کے لئے نامناسب بھی ہوسکتی ہے۔
(۳) بچّہ سے یہ نہ کہیئے "ایسا نہ کرو" بلکہ اسے یہ سُننے کا عادی بنائیے کہ "ایسا کرو تو اچھا ہے!" بچّہ کے لئے ایک دروازہ بند کیجئے تو دُوسرا فوراً کھول دیجئے ۔
(۴) یہ خیال نہ کیجئے کہ بچّہ سے آپ جو کہہ رہے ہیں وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ کم سمجھے یا بالکل نہ سمجھے ۔
(۵) کوئی وعدہ کیجئے، تو ضرور پُورا کیجئے ۔
(۶) کوشش کیجئے، کہ بچّوں کے سامنے آپ ایک بہترین نمونہ بن سکیں۔ تاکہ آپ ایک اچھا اسوہ بن سکیں، جس کی تقلید کی جائے ۔
(۷) بچّہ اگر زمین پر گر پڑے، یا کھانا چھوڑ دے، تو پریشان نہ ہوجئے، بلکہ ایسا کام کیجئے، جس سے اسے مدد ملے ۔
(۸) بچّہ کی تربیت کے لئے جو اصول یا ضابطے بنائیے ان میں مستثنیٰ مثال کسی کی نہ رکھئے ۔
(۹) بچّہ پر اپنی رغبت مسلط نہ کیجئے۔ اس کی رغبت میں اس کا ساتھ دیجئے ۔
(۱۰) بچّوں کی موجودگی میں ان کے حالات پر بحث نہ کیجئے۔
(۱۱) بچّہ پر کوئی کام ایک دم سے نہ ڈال دیجئے۔ اسے موقعہ دیجئے کہ وہ آسانی سے اُسے کرسکے ۔
(۱۲) بچّہ کا مذاق نہ اُڑائیے، اس کے ساتھ ہنسئے ۔

معلّمین کے لئے

بچّوں کی تربیت کا انداز و اسلوب

بچّوں کی تربیت کوئی آسان کام نہیں ہے - یہ کام بہت زیادہ غور و فکر، احتیاط اور تجربہ کا محتاج ہے - مختلف عادات و اطوار اور مزاج رکھنے والے بچّوں کے لئے کوئی ایک کلّیہ تو نہیں مرتب کیا جا سکتا - پھر بھی ایک عام اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں معلّمین کی رہنمائی کے لئے چند باتیں درج کی جاتی ہیں - ان پر اگر عمل کیا گیا تو بہت سی مشکلوں سے نجات مل جائے گی اور تربیت و تہذیب کا کام نسبتاً آزاد ہو جائے گا ٭

تربیت و تہذیب

(۱) کوشش کیجئے کہ اپنے شاگردوں اور بچّوں کی عقلی صلاحیت کا صحیح اندازہ کر سکیں اور ان کی رغبت و میلان کو پہچان سکیں ٭

(۲) یاد رکھئے، بچّوں کے اخلاق و طبائع میں بہت اختلاف ہوتا ہے ہر بچّہ سے وہی سلوک کیجئے، جو اس سے مناسبت رکھتا ہو - جو بات زید کے لئے

(۱۳) بچّہ کے کام میں صرف ضرورت کے وقت مداخلت کیجئے ۔

(۱۴) بچّہ کی طبیعت پر بھروسہ کیجئے ۔

(۱۵) بچّہ کو مناسب آزادی دیجئے ۔

(۱۶) بچّہ میں اعتمادِ نفس کا جذبہ پیدا کیجئے ۔

(۱۷) بچّہ کو مشق و تمرین کا کافی موقع دیجئے ۔

(۱۸) بچّہ کی حوصلہ شکنی نہ کیجئے ۔ اس کی حوصلہ افزائی کیجئے ۔ مثلاً "آج تم نے کل سے اچھّا کام کیا۔ امید ہے کل تم اس سے بھی اچھے ثابت ہوگے"۔

(۱۹) مشکلات کے حل میں بچّہ کی مدد کیجئے ۔

(۲۰) بچّہ کی غلطیوں کی اصلاح نرمی سے کیجئے ۔

(۲۱) بچّہ کی شخصیت کو اُبھاریئے ۔

(۲۲) بچّوں کے ساتھ عدل و مساوات کا برتاؤ کیجئے ۔ دو بچّوں سے اگر ایک ہی جُرم ہو تو یا دونوں کو معاف کردیجئے ۔ یا دونوں کو سزا دیجئے ۔

(۲۳) بچّوں کے جھگڑے کی حوصلہ افزائی نہ کیجئے ۔ بلکہ ان میں تعاون اور اشتراک کی روح پیدا کیجئے ۔

(۲۴) بچّہ میں صداقت کا شعور پیدا کیجئے ۔

(۲۵) بچّہ کی رُوح کو اُبھاریئے ۔

(۲۶) بچّہ کو مایوس نہ ہونے دیجئے ۔

(۲۷) یہ تمنّا نہ کیجئے ۔ کہ بچّے آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلیں ، انہیں وہی کرنا چاہیئے جو ان کی طبیعت کے مناسب ہو !

افلاطون کا قول ہے " اچھی ابتدا، کمال و سعادت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے!" انگریزی زبان کی ضرب المثل ہے ۔" اچھی ابتدا، آدھے کام کا ہو جانا ہے ۔" (Well begun is halfly done)

پس اے ماؤں اور باپُو، اے اُستانیو اور استادو، اپنے بچّوں اور بچیوں اور شاگردوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو وہ تمہاری محبت اور شفقت کے بھوکے ہیں ۔ تمہارے سوا ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں ۔یاد رکھو بچّے بڑی قیمتی پُونجی ہیں، جو تمہارے سپرد قدرت کی طرف سے کئے گئے ہیں ۔ اس امانت کی حفاظت کرو ۔ ان چھوٹی روحوں کو پامال نہ کرو ۔ ان کے دِلوں کو مرنے نہ دو ۔ آج کے بچّے کل کے نوجوان بنیں گے ۔اور ساری قوم ان ہی سے عبارت ہوگی ۔ آج اگر اچھّی فصل بوؤگے تو کل اچھّی فصل کاٹوگے ۔

فنِ تدریس

معلّم کو کیا اور کیسا ہونا چاہئے؟

معلّم کے ذمّے بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ اور وُہ کام ہے علم اور سوسائٹی کی خدمت۔ اس اعتبار سے معلّم کا درجہ سب سے اونچا اور بڑا ہے۔ خود سرکارِ دو عالم نے علم کا اعتراف فرمایا ہے۔ اور تعلیم کی طرف رغبت دی ہے۔

جرمنی کے مشہور دینی مصلح مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ — ۱۵۴۶ء) کا قول ہے:۔ "اگر مجھے وعظ و ارشاد سے فرصت ملتی، تو میں تعلیم کے سوا کوئی اور کام نہ کرتا۔" اس قول کی روشنی میں، اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مدرسہ ہی در اصل اصلاح و تعمیر کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ مدرّس ہی کا کام ہے کہ وُہ اپنی قوم کو، ترقی یافتہ بنا دے، اور اسے ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ ارسمس کا قول ہے:" مجھے ایک مدرسہ سونپ دو، میں ساری دُنیا کو منقلب کر دینے کا عہد کرتا ہوں۔"

معلّم کا کام | معلّم کا کام کیا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے؟

وہ بچّوں اور نوجوانوں کے افکار میں جِلا پیدا کرتا ہے۔ ان کے شعور کو بیدار کرتا ہے ان کی عقلوں کو زندگی بخشتا ہے۔ ان کے ادراک کو ترقی دیتا ہے۔ وہ انہیں باطل کے مقابلے میں حق کے ہتھیاروں سے مسلح کر دیتا ہے۔ انہیں فضیلت کے ہتھیار دیتا ہے تا کہ وہ رذیلت کو ہلاک کر دیں۔ انہیں علم دیتا ہے تا کہ وہ جہل کا خاتمہ کر دیں۔ وہ تھکی ماندی روحوں کو زندگی کا پیام دیتا ہے۔ سوئی ہوئی عقلوں کو جگا دیتا ہے۔ ضعیف شعور کو توانا کر دیتا ہے۔ وہ ایک روشن مشعل ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کہ راستہ کی تاریکی دُور ہو جائے۔ وہ مُردہ زمین کو پھر سے سرسبز کر دیتا ہے وہ ٹُنڈ مُنڈ درخت کو بار ور کر دیتا ہے ؎

تعلیم، رہبانیت کی ایک قسم ہے۔ جس طرح ایک راہب دین کے لئے دنیا کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ایک عالم، علم کے سوا، ساری دُنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے راہب کو دیکھیں جو حُبِّ دُنیا اور حُبِّ جاہ کے مرض میں گرفتار ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ سچّا اور پکّا راہب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی عالم کو سیم و زر کا بندہ دیکھیں تو یقین کر لیجئے، اس کا علم کھوٹا ہے ؎

دُنیا کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ لوگ جن کاموں کے لئے خلق نہیں ہوئے ہیں، وہی کرتے ہیں یہ بہترین دستکار بن سکتا ہے۔ لیکن وکالت کے پیچھے

پڑا ہے ۔ وہ بہترین وکیل بن سکتا ہے ۔ لیکن دستکاری میں اُلجھا ہوا ہے ۔ یہ طبقہ معلّمیت کی صف میں بھی موجود ہے ۔ بعض لوگ پیدا ہوئے ہیں روپیہ پیدا کرنے کے لئے ، لیکن پیشہ معلّمی کا اختیار کر رکھّا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دُنیا میں بالکل ناکام رہتے ہیں ۔ نہ اِدھر کے رہتے ہیں ، نہ اُدھر کے !

لیکن معلّمین کی کچھ شکایتیں بھی ہیں اور وہ بجا بھی ہیں ۔ راہب کو ہماری سوسائٹی ، اچھّی غذا ، اچھّا لباس دیتی ہے ۔ اور معلّم اس سے محروم ہے ۔ راہب شادی نہیں کر سکتا ۔ اپنی خانقاہ میں مگن رہتا ہے ۔ اس پر کسی کا بوجھ نہیں ہوتا ۔ معلّم کو شادی کرنا پڑتی ہے خانگی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے ۔ دُوسروں کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے ۔ لیکن اس کی اس مشکل کو آسان کرنے کی طرف توجّہ نہیں کی جاتی ؛

لوگوں کو اگر عقل سے دُشمنی نہ ہوتی تو وہ معلّم کو ہر ضرورتِ دُنیاوی سے بے نیاز کر دیتے ۔ اگر وہ اشیا کی قدر و قیمت کا اندازہ رکھتے ہوتے ، تو معلّم کی قیمت سب سے زیادہ لگاتے ؛

مدرّس کی حیثیت

ہمیں مدرّس کی حیثیت اور اہمیت پُورے طور پر محسوس کرنی چاہیئے ۔ تاکہ وہ اپنے اقوال و افعال اور حرکات و سکنات میں مدرسہ کے اندر اور باہر کھیل کے میدان میں اور کلاس کے اندر ، ایک بہترین اور

قابلِ تقلید نمونہ طلبہ کے لئے بن سکے۔ اسے طریقِ تدریس سے آشنا ہونا چاہیئے۔ بچوں کی نفسیات پر بھی عبور ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ ان کی صحیح تربیت کر سکے ؛

شاگردی سے اُستادی تک

طالب علم کو مدرسہ کے اندر، تربیت گاہ کے اندر، ٹریننگ کالج میں ہر جگہ اور ہمہ وقت طالب علم ہی رہنا چاہیئے۔ بحث و درس اور تنقیب و اطلاع سے اُسے پوری رغبت ہونی چاہیئے۔ صرف اسی طرح وہ سچا اور مکمل مدرّس بن سکتا ہے اور پھر اس کا شمار بہترین ماہرینِ تعلیمات میں ہو سکتا ہے ؛

مدرّس کی اصلاح

مدرسین کا ایک بہت بڑا طبقہ اصلاح کا محتاج ہے۔ ان کا اکثر وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اور طلبہ ان سے ذرا بھی فائدہ نہیں اُٹھا پاتے۔ مدرّس کو چاہیئے کہ وہ خود ہی اپنے دِل سے حسبِ ذیل سوالات کرے:-

(۱) کیا وہ اپنی وسعت کے اوقات کا صحیح استعمال کرتا ہے ؟

(۲) کیا اس کی ذہنی و بدنی ریاضتوں کا کوئی نتیجہ نمودار ہوا ؟

(۳) کیا اس کے شاگردوں میں اس مقصد کی لگن پیدا ہوئی جسے وہ پیدا کرنا چاہتا تھا ؟

وہ مدرّس ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا جس کی کوشش

ناکام ہوں - اور جس کے عمل کا نتیجہ سامنے نہ ہو - اور جس کے شاگرد، اس سے پورے طور پر مستفید نہ ہوتے ہوں ؛

مدرّس کا فرض

تربیتِ جدیدہ کے اصولوں میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ معلّم طلبہ کے کاموں میں از خود دخل نہ دے - بلکہ انہیں موقع دے کہ وہ خود اپنا کام کریں - معلّم صرف اس وقت دخل دے جب وہ خود مدد کے طالب ہوں ؛

مدرّس کا کام اور فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ میں لگن پیدا کرے - انہیں تفکّرِ مستقل اور عملِ مستقل کا عادی بنائے - انہیں کثرتِ مطالعہ کی ترغیب دے - انہیں تلاش و تجسّس کی لذّت سے آشنا کرے - ان کے معلومات منظّم کرے - اور ان کے عمل کو پرکھے - ان کی نگہداشت کرے - کہ وہ غلط راستے پر نہ چل پڑیں اور جب وہ حاجتمند ہوں تو ان کی مدد کرے ؛

مدرّس کو چاہیئے کہ ہر روز وہ اپنے دل سے پوچھتا رہے :-

(۱) میں کس طرح پڑھاتا ہوں ؟

(۲) طلبہ میں تعلیم کی لگن کس طرح پیدا کرسکتا ہوں ؟

(۳) اپنے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کس طرح میں شاگردوں کو نشاط و رغبت کے ساتھ آمادۂ کار کرسکتا ہوں ؟

(۴) اپنے شاگردوں کو وہ آزادی کس طرح دوں کہ مجھے مداخلت کی ضرورت نہ پڑے اور ان کے

کام انہی پر چھوڑ دوں ؟

مدرّس کے واجبات

مدرّس اگر اپنے پیشہ میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تربیت کے جدید اصولوں سے پوری طرح واقف ہو ، جو یہ ہیں :-

(۱) مدرّس کا عمل منظم اور مرتب ہونا چاہیئے ۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ آج اسے کیا کرنا ہے ؟ اس ہفتہ میں اسے کیا کرنا ہے ؟ یہ موضوع کہاں سے شروع ہوتا ہے ؟ کہاں ختم ہوتا ہے ؟ وہ اپنے کام کو کس طرح تقسیم کرے کہ سال بھر کے اندر کورس بھی پورا ہو جائے ، اور طلبہ کو مراجعت اور اعادہ کا وقت بھی مل سکے ؟

(۲) مدرّس کو چاہیئے کہ درس اس طرح دے کہ ساری جماعت اسے اچھی طرح سمجھ لے ۔ مدرّس کا کام ، طلبہ کی رہنمائی ہے ۔ عمل کی ترغیب دینا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ خود فکر و عمل کے استقلال پر قادر ہو جائیں ۔

(۳) اسباق کے ماتحت فرد ، اور جماعت کے لئے کام معیّن کرے ۔ اور دیکھے کہ عقل و استعداد کے مطابق ، ہر ایک اپنا کام کر رہا ہے یا نہیں ؟ مدرّس کو چاہیئے کہ وہ اپنے طلبہ کے لئے ، اخبار کا منبع علم کا مصدر بن جائے ۔ جو مدد کا طالب ہو ، اس کا مددگار بن جائے ۔ آپس کے تنازعات

کا فیصلہ کامل عدل اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ کرے ۔ وہ ایسا سراپا محبت و شفقت باپ بن جائے ، جو اپنے بچوں کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتا ہے ۔ ان کی منفعت کے بارے میں ہر وقت سوچتا رہتا ہے ۔ انہیں عمل کی ترغیب دیتا رہے ۔

(۴) مدرّس کو اس نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنا چاہئے کہ : " شاگردوں سے باتیں کم کرو ، نگرانی زیادہ کرو دیکھو ان کا کون سا پہلو مضبوط ہے ۔ اور کون سا کمزور ؟ یاد رکھو ، کم کام ، اگر وہ صحیح ہو ، زیادہ کام سے بہتر ہے ۔ مدرّس کو یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے ۔ کہ تلامیذ نصیحت اور رہنمائی کے جویا رہتے ہیں ۔ یہ قطعاً مناسب نہیں کہ مدرّس لکھ دے ، اور وہ نقل کر لیں ۔ بغیر معنی اور مطلب سمجھے ہوئے ، اس طرح انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ۔

(۵) طفل کو تفکیر کا عادی بنانا چاہئے ۔ اسے مناسب آزادی دینی چاہئے ۔ کہ وہ اپنا کام خود کر سکے ۔ اپنے آپ پر اعتماد کر سکے ۔ یہاں تک کہ پیش آمدہ تمام دشواریوں پر خود ہی غالب آجائے ۔

(۶) یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ اطفال کو دفعتہً بہت زیادہ آزادی دے دی جائے ۔ آزادیٔ عمل رفتہ رفتہ دینی چاہئے ، پوری اور کامل نگہداشت کے ساتھ

(۷) تلامیذ کو اس کا خوگر بنانا چاہیئے کہ وہ دُوسری طرف دیکھے بغیر، اپنے اوپر اعتماد کرسکیں ۔

(۸) بچّوں کی نگرانی

بچّوں اور شاگردوں کو اس طرح آزادئ کار ملنی چاہیئے کہ وہ یہ نہ محسوس کرسکیں کہ کوئی ان کے سر پر کھڑا ہے ۔ وہ اطمینان و دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کریں ۔ اگر بچّہ کو کام کی پوری فرصت نہ دی جائے ، اور اسے موقع نہ عطا کیا جائے تو وہ صحیح طور پر اپنا مفوضہ کام نہیں انجام دے سکتا ۔ یہ اعتماد علی النفس کا کام گھر اور باہر ہر جگہ ہونا چاہیئے ۔ ماں کو چاہیئے کہ ہر وقت وہ بچّہ پر پابندیاں نہ عائد کرے ۔ کبھی کبھی اسے تنہا بھی جانے دے ۔ جو ماں ہر وقت بچّہ کو سینہ سے چمٹائے رہتی ہے وہ اس سے سچّی محبّت نہیں کرتی بلکہ اسے غلام فطرت بنا دیتی ہے ۔ وہ اس سے اعتمادِ نفس کی نعمت چھین لیتی ہے ۔ وہ اسے موقع نہیں دیتی کہ وہ خود سے اُٹھے ، خود سے بیٹھے خود سے زندگی کا مقابلہ کرے ۔ ہر وقت اس پر مسلّط رہتی ہے ۔ اسے ذرا بھی آزادی نہیں دیتی وہ اس کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے ۔ اور اس مغالطہ میں مبتلا رہتی ہے کہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے ۔ علم النفس اور تربیت کے بڑے بڑے ماہرین کا خیال ہے کہ مدرسین یا آیا کی طرف سے بچّہ

پر بہت زیادہ محبّت کا اظہار اس کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے ۔

ایک اچھّے مدرّس کا کام یہ ہے کہ وہ بچّہ پر مسلّط رہے ۔ لیکن اسے محسوس نہ ہونے دے۔ اس کے اشاروں کو سمجھے ۔ اس کی مرضی کو پہچانے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے ۔ لیکن کمزور بن کر نہیں ۔ اس پر حکمرانی کرے لیکن سختی کے ساتھ نہیں ۔

(۹) آزادی مدرّس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تربیت جدیدہ نے آزادیٔ عمل کی بہت بڑی گنجائش تلمیذ کے لئے رکھی ہے۔ یہ آزادی بہت سوچ سمجھ کر دینی چاہیئے ۔ ایک لڑکے کے لئے جتنی آزادی مناسب ہے ، دُوسرے کے لئے وہ قطعاً مضر ہے ۔ وہ آزادی بھی کوئی قیمت نہیں رکھتی جس میں ایک آدمی، ہر کام میں دُوسرے کی امداد و اعانت کا محتاج اور جویا ہو ۔ وہ آزادی بھی بے معنی ہے جس میں میلان و رغبت پر پہرے لگے ہوں ۔ بچّہ کو آزادی اس طرح دینی چاہیئے ، اور اس میں آزادی کے استعمال کا ملکہ اس طرح پیدا کرنا چاہیئے کہ خود بُرائی اور اچھائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ۔

مدرس کا عمل اور اثر کوئی دانش مند بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ قوم اور سوسائٹی کی ترقی اور فروغ میں مدرّس کا بہت

بڑا حصّہ ہے۔ علمی، ادبی، خلقی، انفرادی، اجتماعی، ہر اعتبار سے، مدرّس کا سب سے اہم کام اصلاح ہے۔ ان عیوب کی اصلاح، جو سوسائٹی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور فرد کو خراب کرتے رہتے ہیں۔ ہم مدرّس سے صرف یہی توقّع نہیں کرتے کہ وہ صرف درس پر اکتفا کرے گا۔ ہم تو اسے ایک ایسا اُسوہ اور نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں، جس سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ جس کی تقلید کی جا سکے ؛

مدرّس کا اثر اپنے تلامذہ پر وہی ہوتا ہے، جو باپ کا اپنی اولاد پر۔ ایک اچھّا مدرّس مدرسہ کیا، سوسائٹی تک کی اصلاح کر سکتا ہے ؛

مدرّس کو چاہیئے کہ وہ طلبہ کے لئے ایسا نمونہ بن جائے جس کی وہ پیروی کریں۔ اسی کے نقشِ قدم پر چلیں۔ کردار و اعمال میں اسی کے اثر سے متاثر ہوں۔ معلّم صرف نام ہی کا معلّم نہیں ہوتا، وہ حقیقی معلّم ہوتا ہے۔ اس کا اثر رُوح، ذہن اور دماغ سب پر ہوتا ہے۔ تعلیم سے بڑھ کر مقدّس کوئی کام نہیں۔ معلّم جیسے اونچے لقب کا مستحق وہی ہو سکتا ہے، جو اہل ہو، جو مردِ کامل ہو، جو پستی سے دُور ہو، بلندی کا خوگر ہو ؛

جیسا مدرّس ویسا مدرسہ

"جیسا مدرّس ویسا مدرسہ" یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ اس لئے کہ مدرّس، طلبہ

کے لئے، ایک نمونۂ کامل ہوتا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ اس کے اخلاق و عادات، حرکات و سکنات، افکار و آرا، اقوال و افعال سب کی تقلید وہ کرتے ہیں پس اگر مدرّس اچھا ہوگا تو مدرسہ میں بھی وہی فضا پیدا ہو جائے گی، ورنہ نہیں۔ یہ بالکل مدرّس کے اختیار میں ہے۔ کہ وہ اپنے طلبہ اور مدرسہ کو جس رنگ میں چاہے رنگ دے، اور جیسا چاہے بنا دے ٭

معلّمی کی تیاری

تدریس کا کام کرتے ہوئے خاص قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مدرّس کی مشغولیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا کام بہت بڑا ہوتا ہے۔ معلّمی کا کام کرنے کے لئے صبر، برداشت اور تحمّل کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ مدرّس کو اخلاق کا پاکیزہ ہونا چاہیئے۔ تعلیم سے اسے طبعی رغبت ہونا چاہیئے۔ اسکول کے کورس سے اسے پوری واقفیت ہونی چاہیئے ٭

مدرّس اور نصاب

مدرّس کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے کورس سے واقف ہو۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ سارے نصاب پر اس کی وسیع نظر ہو تاکہ وہ اپنے علم اور طرزِ تعلیم سے طلبہ کے قلوب پر چھا سکے ٭

سب سے پہلے مدرّس کو مادّۂ تعلیم پر غور کرنا

چاہیئے ۔ اگر وہ کورس پر قادر اور غالب ہے ۔ تو وہ آسانی کے ساتھ کامیاب ہوگا ۔ اسے چاہیئے کہ جو سبق پڑھائے اس کی پہلے سے مکمل تیاری کرلے ۔ اپنی فرصت کے اوقات حصول معلومات میں صرف کرے ۔ جو مدرس ان امور کا لحاظ نہیں کرتا ۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ۔

عمل کی محبت | مدرس اگر چاہے ، تو وہ اپنے طلبہ کے اندر علم ، مدرسہ اور عمل کی محبت پیدا کر سکتا ہے ۔ اپنے اسباق ذہنی اور عملی طور پر ان کی رگ و پے میں جاری و ساری کر سکتا ہے ۔ لڑکوں میں علم کا ایسا شوق پیدا کر سکتا ہے کہ جب تک درس ختم نہ ہو جائے ۔ ان کا اٹھنے کو جی نہ چاہے ۔ تلامذہ میں تشویق پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ درس اور نصاب مختصر ہو ۔ زیادہ طویل نہ ہو اور درس میں ہاتھ سے کرنے والے کام بھی شریک ہوں ۔

حفظِ نظام | جو مدرس اپنے شاگردوں کو ضبط و نظام کا خوگر نہ بنا سکے ۔ اور بغیر کسی مار دھاڑ ، ڈانٹ ڈپٹ کے محض اپنی شخصیت کے اثر سے انہیں راہ راست پر نہ لا سکے ، وہ اس قابل نہیں کہ اسے مدرس کہا جائے ۔ وہ اس کا اہل نہیں کہ مدرس بنایا جائے ۔

مدرس پر اعتماد | طلبہ کو مدرس پر اتنا ہی اعتماد

ہونا چاہیئے ۔ جتنا فوج کو کماندار پر ہوتا ہے ۔ اگر فوج اپنے جرنیل پر اعتماد نہ کرے تو شکست، بغاوت، یا فرار یقینی ہے ۔ اسی طرح اگر طلبہ اپنے معلّم پر اعتماد نہ کرتے ہوں تو نہ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں، نہ یہ ؛

اخلاصِ عمل

طلبہ جس مدرّس کو اچھا معلّم دیکھتے ہیں ۔ اسے چاہنے لگتے ہیں اور اپنے ایام شباب میں بالکل ویسا ہی بن جانے کی تمنا کرنے لگتے ہیں ۔ وہ اپنے طلبہ کے سامنے سب سے بڑی اور بہتر مثال ہوتا ہے ۔ اس کی موجودگی ان میں علم کا شوق پیدا کرتی اور اس کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے ؛

یاد رکھنا چاہیئے ۔ اگر مدرّس اپنے کورس پر غالب ہے، تو اس کی کامیابی یقینی ہے ۔ لیکن اسے بھی نہ بھولنا چاہیئے ۔ کہ مدرّس کو کثرتِ مطالعہ کا عادی ہونا چاہیئے ۔ اپنے موضوع کے علاوہ دوسرے موضوعوں پر بھی اس کی اچھی نظر ہونی چاہیئے ۔ مدرّس کا موضوع اگر جغرافیہ ہے، تو اسے تاریخ داں بھی ہونا چاہیئے ۔ علمِ طبقات الارض اور نباتات میں بھی درک ہونا چاہیئے ؛

مدرّس کی کامیابی
کا
دُوسرا اہم ترین عامل

آپ بہت سے ایسے آدمیوں کو دیکھیں گے جنھوں نے معلمی اور اُستادی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ لیکن طبعًا جنہیں تدریس و تعلیم سے ذرا بھی مس نہیں ہے۔ جو تربیت اور مدارس کے ضبط و نظم کے فن و اصول سے قطعًا ناواقف ہیں۔ جو بچوں کو، اور ان کے طبائع کو ذرا بھی نہیں پہچانتے۔ یہ اس کے مستحق ہیں کہ بجائے اس کے کہ پڑھائیں، خود پڑھیں اور خوب پڑھیں۔ علوم تربیت میں درک پیدا کریں اور سیکھیں کہ کس طرح پڑھایا جاتا اور تعلیم دی جاتی ہے۔ انہی لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جنہیں طبعًا اور فطرتًا، تعلیم و تدریس سے دلچسپی ہے۔ کھوج لگانے کے بعد معلوم ہوگا۔ ان کی بچپن سے یہ عادت تھی۔ کہ مدرسہ میں جو کچھ پڑھ کر آتے، اپنے گرد اپنے سے چھوٹے بچوں کو جمع کر لیتے، اور انہیں

پڑھانے لگتے۔ ایسے لوگ اگر فنِ تعلیم و تربیت میں دستگاہ پیدا کرلیں تو یہ بہترین مدرّس بن سکتے ہیں۔

ایک قصّہ ایک مرتبہ ایک مدرّس نے شکایت کی کہ وہ پڑھانے میں کامیاب نہیں ہوتا، اس سے پوچھا گیا "فنِ تربیت و تعلیم پر خود تم نے کیا پڑھا ہے؟" اس نے جواب دیا "کچھ نہیں!" اس سے کہا گیا "پھر اگر تم ناکام ہو تو اس میں تعجّب کی کیا بات ہے؟"

یہ مدرّس پھر ایک ٹریننگ کالج میں داخل ہوا، اس نے تربیت و تعلیم سے متعلّق کتابوں اور رسالوں کا اندھا دھند مطالعہ شروع کر دیا۔ علم النفس پر جو کتاب ملی، دیکھ ڈالی۔ یہاں تک کہ اس میں تعلیم دینے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ اور تدریس کے فن پر اس کی اچھی نظر ہوگئی۔ نیا مدرّس، جب کسی درسگاہ میں قدم رکھتا ہے، تو وہ حیران و پریشان ہو جاتا ہے، کہ کیا کرے؟ اس پریشانی اور حیرانی کا علاج صرف یہ ہے کہ فنِ تربیت سے متعلّق زیادہ سے زیادہ واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ علمائے تربیت میں سے اکثر کا خیال ہے کہ "معلّم بنایا نہیں جاتا بنتا ہے!"

چند اور باتیں ایک مدرّس کے لئے اپنے فن کی تعلیم کے علاوہ چند اور باتوں کی طرف بھی متوجّہ ہونا ضروری ہے:-

(۱) مدرّس کو کافی وقت ملنا چاہیئے۔ وہ دوسرے

مدارس کا معائنہ کرے۔ وہاں کا طریقِ تعلیم اور اندازِ تربیت دیکھے۔ یہ مطالعہ ناقد کی حیثیت سے نہیں، متعلّم کی حیثیت سے ہونا چاہیئے۔ یعنی جو اچھّا ہو، وہ لے لے جو بُرا ہو اُسے ترک کر دے ؛

(۲) مدرّس کو چاہیئے۔ کہ وہ تمام لیکچروں میں شرکت کیا کرے۔ اس سے اس کی علمی منزلت میں اضافہ ہوگا۔ ہر لیکچر سے کچھ نہ کچھ کام کی باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں ؛

تربیت کی تعلیم

جس طرح علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح تربیت کی تعلیم بھی حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ بھی ایک مستقل فن ہے ایک حکایت سنیئے :۔

(۱) ایک مدرسہ میں ایک نوجوان کا مدرّس کی حیثیت سے تقرر ہؤا۔ یہ شخص فنِ تربیت و تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھا۔ لیکن اپنے کام میں تن دہی اور اخلاص کے ساتھ لگ گیا، لیکن ناکام۔ چند ہفتوں کے بعد تو زندگی اس پر تنگ ہوگئی۔ آخر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی ساری امیدیں اکارت گئیں جو اس نے مدرس بننے سے متعلق باندھ رکھی تھیں۔ ایک دن اس کی ملاقات اپنے اُستاد سے ہوئی جو اسے بہت چاہتا تھا۔ اُستاد کے سامنے وہ اُبل پڑا اور اپنی دُکھ بھری کہانی سُنا ڈالی۔ اُستاد نے کہا "بے شک تم کامیاب مدرّس نہیں

بن سکتے ۔ لیکن جانتے ہو کیوں نہیں بن سکتے ؟ کیا تم نے تربیت و تعلیم سے متعلق ایک کتاب بھی پڑھی ہے ؟" پھر اس نے نصیحت کی کہ کسی ٹریننگ کالج میں پہلے ٹریننگ لے لو ، پھر مدرّس بنو ۔ یہ بات اس کے دِل پر جم گئی ۔ وہ ایک ٹریننگ کالج میں داخل ہوگیا اور فنِ تعلیم و تربیت پر اس نے مہارت حاصل کرلی ۔ پھر جو وہ مدرّس بنا ہے ، تو تمام ہمسروں سے بازی لے گیا ۔

(۲) مدرّس میں ذکاوت کے ساتھ قوتِ تخلیق بھی ہونی چاہیئے ۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ ایک بغیر دوسرے کے بے کار ہے ۔

(۳) علم کے ساتھ تجربہ بھی لازمی اور ضروری ہے ۔

(۴) صرف تجربہ ناکافی ہے ۔ تجربہ کے ساتھ اچھا ماحول ، اور اچھی صحبت بھی لازمی ہے ۔

مُدرّس کے صفات

اب ہم ان صفات و خواص کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جو مدرّس میں کثرت کے ساتھ ہونے چاہئیں:

پہلے باپ یا مدرّس

مدرّس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے شاگردوں سے وہی محبت کرے جو ایک باپ اپنے بیٹوں سے کرتا ہے۔ اور ان کے بارے میں اسی طرح فکرمند ہو جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کے لئے فکرمند ہوتا ہے۔ ہر تربیت دہندہ کو یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ قبل اس کے کہ وہ کسی کو آدمی بنانا چاہے خود آدمی بن لے۔ اپنی اولاد کو اگر کامل بنانا چاہتے ہو، تو پہلے خود کامل بنو۔ اپنے بیٹوں کو اخلاقِ فاضلہ کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے ہو تو خود بھی صاحبِ اخلاق بنو۔ اپنے بیٹوں اور شاگردوں کا احترام کرو۔ وہ تمہارا احترام کریں گے۔ بچّہ کی شخصیت کا احترام کرو۔ تاکہ وہ اپنے امیال و عواطف ظاہر کرسکے۔

ایک مدرّس اگر اپنے فن اور علم سے پُورے طور پر واقف ہے۔ تو بھی وہ کامیاب نہیں ہوسکتا، جب تک اس کا دِل بچّوں اور شاگردوں کی محبت سے لبریز نہ ہو۔ جو مدرسہ اطفال کی محبت سے خالی ہو وہ تلامیذ

اور مدرسین کا اکھاڑہ بن جاتا ہے ۔ اگر معلمین کے دلوں میں شاگردوں کی محبت نہیں ہے تو وہ اس سے بھاگیں گے ۔ اس کے خلاف دل میں کینہ رکھیں گے ۔ آپ اکثر دیکھیں گے شروع شروع میں بچے معلم سے محبت کرتے ہیں پھر جیسے جیسے پہچانتے جاتے ہیں ، اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں ۔ مدرسہ میں آنے سے ہچکچانے لگتے ہیں ۔

ولایاتِ متحدّہ امریکہ کے ایک مدرسہ کا واقعہ ہے ایک مدرّس نے مدرسہ کے پرنسپل کو ایک طالب علم کی رپورٹ بھیجی کہ اسے اس کے درجہ سے کسی دُوسرے نیچے درجے میں منتقل کر دیا جائے ۔ اس لئے کہ وہ شریر اور مجرمانہ ذہنیت کا لڑکا ہے ۔ یہ لڑکا بہت بد زبان ، بد اخلاق اور روکھا سوکھا تھا ۔ پرنسپل نیا نیا آیا تھا ۔ وہ اس لڑکے کی خانگی حالت سے ناواقف تھا ۔ اس نے لڑکے کو اپنے دفتر میں بُلایا ، اور اس سے باتیں کیں ۔ اس نے سوچا سزا دینے سے پہلے اس کے والدین سے بھی پُوچھ گچھ کر لینی چاہئے ۔ چنانچہ وہ اس کے گھر گیا ۔ ایک چھوٹا سا گھر تھا ۔ صِرف دُو کوٹھریاں تھیں ۔ ماں گھر میں تھی ۔ پرنسپل نے اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی ۔ اور لڑکے کی شکایت کی ۔ اور بتایا کہ اب وہ اس کا درجہ گِرا دے گا ۔ اور بید مارے گا لیکن ماں نے کچھ پروا بھی نہیں کی ۔ اب وہ واپس جا ہی رہا تھا کہ ایک بد صورت اور شقی آدمی آتا ہؤا دکھائی

دیا۔ پرنسپل کو یقین ہو گیا۔ یہی باپ ہے۔ اس نے اسے بھی تمام واقعہ کی خبر دے دی۔ باپ نے پرنسپل کے سامنے لڑکے کو خوب ٹھونکا۔ اور پرنسپل سے گالیاں دیتے ہوئے کہا در آئندہ آپ یہاں آنے کی تکلیف نہ کیجئے گا۔ آپ کو اجازت ہے جب جی چاہے اسے قتل کر دیجئے!"

پرنسپل لڑکے کو اپنے ساتھ مدرسہ واپس لایا۔ یہ رنگ دیکھ کر اس کا غصّہ اُتر گیا۔ اور بچّہ سے رحم کا برتاؤ کرنے کا خیال اس کے دِل میں پیدا ہو گیا۔ اور بجائے سزا دینے کے اس سے وہ ملاطفت کا سلوک کرنے لگا۔

اُستاد اور شاگرد

مدرّس اور تلمیذ کے درمیان رُوحانی رشتہ اور تعلّق ہونا چاہیئے۔ وہی رشتہ جو باپ کا بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے ہاں زیادہ تر مدرّس اور تلمیذ کے درمیان ضرب و عقاب کا رشتہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ مدرس اپنے طلبہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ان سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ اس اندیشہ سے کہ اگر ان میں گھل مِل گیا تو اپنی کرامت اور بزرگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیکن یہ بالکل سہل خیال ہے۔ مدرّس اگر صحیح طور پر اپنے فرائض انجام دے تو واقعی وہ باپ کا درجہ حاصل کر لے سکتا ہے۔ اس کی تعزیر میں بھی شفقت جھلکتی ہو۔ غبی اور شریر، سب اس کی محبت سے سیراب ہوتے ہوں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مدرّس کو باپ کا قائم مقام

ہونا چاہیئے، تو باپ سے ہماری مراد، صرف باپ نہیں ہے۔ ماں باپ دونوں ہیں۔ مدرّس ماں اور باپ دونوں کی نیابت کرتا ہے۔ اس میں باپ کی سختی اور ماں کی نرمی دونوں چیزیں ہونی چاہئیں ؂

(۳) بچے اور بچپن کی تعلیم

ہمارے دور میں ہماری سوسائٹی کا سب سے بڑا جرم یہ ہے۔ کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ یہ خیال کچھ عام سا ہو گیا ہے۔ کہ بچہ طبعاً شریر ہوتا ہے۔ اور اس کی شرارت صرف سونٹے ہی سے دُور کی جا سکتی ہے۔ اس کے فطری میلانات اور طفلی لذات کا قلع قمع کرنے کا واحد ذریعہ ڈنڈا ہے۔ اسی جہالت کے سبب آبا بچوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اور ان سے امر محال کی توقع کرتے ہیں۔ بچپن ہی کے زمانہ میں انہیں کسب معیشت پر لگا دیتے ہیں۔ خواہ وہ کارخانہ کی مزدوری ہو، یا کسی گھر کی ملازمت۔ کیا قوم سمجھتی ہے کہ وہ کانٹے بوئے گی، اور گلاب کے پھول کاٹے گی؟ ہرگز نہیں۔ وہ وہی کاٹے گی جو بوئے گی۔ وہ کانٹے کاٹے گی۔ گلاب کے پھول نہیں۔ بچوں کی عدالت کے ایک امریکی جج نے ایک مقدمہ میں اپنا فیصلہ دیتے ہوئے صاف و صریح الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ ان جرائم کے اسباب میں "بچوں کی عدم نگہداشت اور عدم تربیت" ہی سب سے بڑا سبب ہے ؂

اگر بچّہ کی تربیت پر پُوری توجّہ کی جائے۔ اسے اچھی سوسائٹی اور اچھّا گھر ملے۔ اس کے معاملات میں حکمت ملحوظ رکھی جائے۔ مدرّس اور تلمیذ کے درمیان محبّت اور شفقت کا رشتہ ہو۔ باپ اور بیٹے کے درمیان عمدہ برتاؤ ہو، تو ایک شیطانِ رجیم بچّہ بھی مَلکِ کریم بن سکتا ہے۔

مدرّس کو اپنے شاگردوں سے الگ تھلگ نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ ان میں گھُل مِل کے رہنا چاہیئے اگر وہ ان کے ساتھ کھیل کے میدان میں گیند کھیلے۔ باغ کی تربیت و تنظیم میں ان کا ہاتھ بٹائے غرض ان کے تمام اعمال میں شریک و سہیم بن جائے تو اور اچھا ہے۔ اسے یہ اندیشہ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ اس طرح اس کا اجلال و احترام طلبہ کے دِل سے کم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ احترام تو ایک ایسا رُوحانی رشتہ ہے۔ جو اخلاص، اتحاد اور تعاون ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ سوچنا چاہیئے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر پرنسپل مدرّسین سے، کمانڈر فوج سے، مدرّس طلبہ سے بے تعلق رہے۔ تو اچھے اور خوشگوار نتائج کیونکر مترتب ہو سکتے ہیں؟

(۴) مدرّس اور سوسائٹی

مدّرس کو ہر قدم پر سوسائٹی کے افادہ کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اسے ہمیشہ یہ محسوس کرنا چاہیئے

کہ تعلیم کی ہر شاخ سوسائٹی کے درخت ہی کا ایک جزو ہے۔ اس طرح مدرّس اپنے طلبہ میں حبِ وطن اور حبِّ قومی کے جذبات پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس طرح طلبہ کے ساتھ ساتھ قوم اور سوسائٹی کی بھی بڑی خدمت کر سکتا ہے ؛

(۵) مدرّس کا نمونہ

مدرّس کو طلبہ کے سامنے ایک اچھا نمونہ بن کر آنا چاہیئے۔ کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی طرف مائل ہی نہ ہو سکیں بچہ سے بڑھ کر بہترین ناقد کوئی نہیں۔ اس کی نظر میں لوثِ اغراض نہیں ہوتا۔ وہی کہتا ہے جو اس کا اعتقاد ہوتا ہے۔ عقل و شعور کے سوا اس کا کوئی اور رہنما نہیں ہوتا۔ وہ آپ سے سچی محبت کرے گا۔ دل سے آپ کی اطاعت کرے گا۔ اگر یقین کر لے گا کہ آپ اس کے مستحق ہیں۔ لیکن پہلے آپ اس کے بن جائیے۔ اسے حکم نہ دیجئے، سمجھائیے ؛

فردبل[1] کا قول ہے :-

> در معلّم اور تلمیذ، امر اور طاعت کے درمیان ضروری ہے۔ کہ ایک حکم اور ثالث کارفرما ہو۔ جو معلّم اور متعلّم دونوں کے لئے یکساں

[1] فریڈرک ولہلم فردبل، جرمنی کا مشہور ماہرِ تربیت و علم النفس، بچوں کی تعلیم و تربیت کا تو خاص طور پر ماہر تھا۔ ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوا، ۱۸۵۰ء میں وفات پائی ؛

کار آمد ہو ۔ یہ حکم یا ثالث حق ہے، یعنی
عدالت جو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں
ہونی چاہیئے!"

(۶) مدرّس اور اخلاص

مدرّس اور اس کے طلبہ کی کامیابی کا سب سے بڑا وسیلہ اور ذریعہ صرف اخلاص ہے ۔ سبق پڑھانے کی تیاری نہ کرنا اور درجہ میں تعلیم دینے کے لئے پہنچ جانا اخلاص نہیں ہے ۔ یہ تضیعِ اوقات ہے ۔ جس سے طلبہ کو بہت نقصان پہنچتا ہے ۔ وقتِ مقررہ پر مدرس اگر درجہ میں نہ پہنچے تو اس سے بھی طلبہ کو کوفت ہوتی ہے ۔ اور ان میں بد دِلی پیدا ہوتی ہے ۔ مدرّس کو اپنے طلبہ کے سامنے حفظِ اوقات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے ۔ اگر مدرس اپنے کلاس میں پانچ منٹ لیٹ آیا ہے ۔ اور درجہ میں فرض کیجئے چالیس طالب علم ہیں تو گویا مدرس نے پانچ نہیں دوسو منٹ ضائع کئے ۔

مدرّس کو یہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس کا کام ناتمام نہ ہو ۔ اور وہ اپنے فرائض و واجبات میں کوتاہی کا مجرم نہ ہو ۔ اس سے کلاس کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ اور درجہ کھیل کا میدان بن جاتا ہے ۔ جہاں تعلیم کی آواز نہیں گونجتی ہنگامہ اور شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی جس کا جی چاہتا ہے کھیلتا ہے ۔ کوئی گانے لگتا ہے ۔

اور کوئی ناچ میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ کتابیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہوتی ہیں طلبہ ایک دُوسرے سے گندے مذاق کرنے لگتے ہیں جس سے مدرسہ اور درجہ کا ضبط و نظم بالکل ختم ہوکر رہ جاتا ہے ؏

(۷) مدرّس اور زندگی

مدرّس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مدرسہ کے باہر کی زندگی، ــــ سیاست، اجتماعیت، ادبیت، علمیت فنیت، ــــ سے پُورے طور پر آشنا ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے طلبہ کی زندگی سنوار سکے۔ انہیں آئندہ زندگی کے لئے تیار کرسکے۔ اگر وہ خود ان چیزوں سے بے بہرہ ہے، تو اپنے شاگردوں کو کیا بتائے گا؟

مدرّس اگر یہ چاہتا ہے کہ تلامیذ کے نفوس میں اس کی بہت زیادہ عظمت و منزلت ہو۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شئونِ حیات کا رازداں ہو۔ عالموں، لیڈروں، موجدوں، سیاست دانوں، فن کاروں اور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نویسوں، مصوّروں کے احوال و کوائف سے پُورے طور پر واقف ہو۔ ایک مدرّس کے لئے، اس سے بڑھ کر شرم کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ وہ اڈیسن، لنکن، واشنگٹن، نیوٹن، نپولین، ہنڈنبرگ، کلمینشو، ولسن، پڈورسکی، مارٹن لوتھر کارلائل، ڈکنس، سر والٹر اسکاٹ، لارڈ ماکولی، صدر لد ہوور، صدر روزدیلٹ، ریمزے میکڈانلڈ، مصطفیٰ کمال،

ایٹلی ، گاندھی ، جناح ، محمّد علی ، چرچل ، ہٹلر ، مسولینی وغیرہ کے ناموں اور کارناموں سے ناواقف ہو۔

ایک مدرّس کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے۔ کہ حیاتِ خارجہ سے واقف ہو ، اسی طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حیاتِ داخلی سے بھی پورے طور پر آشنا ہو وہ اپنے مُلک کے حالات سے واقف ہو۔ اس کی قدیم و جدید تاریخ سے واقف ہو اس کی صنعت و زراعت سے بھی اسے واقفیت ہو اس کی تجارت اور سیاست بھی اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو۔ اس کے لیڈر ، عالم ، ادیب اور شعرا بھی اس کی نظر میں ہوں۔ تاکہ وہ اپنے تلامیذ کے افکار میں پختگی اور ہمواری پیدا کر سکے ۔

حیاتِ خارجی و داخلی کے معاملات و مسائل کی طرح مدرّس کو حیاتِ علمی سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھنا چاہیئے۔ اسے ہوائی اڈہ ، ہوائی جہاز ، سرنگ ، بم ، آبدوز کشتی ، توپ اور گولے ، کہربا اور بخار کی طاقت ، علم و اختراع سے بھی کچھ نہ کچھ واقف ہونا چاہیئے۔ تاکہ اگر طلبہ میں سے کوئی اس قسم کے معاملات پر اس سے سوال کر بیٹھے تو وہ گونگا نہ ثابت ہو ۔

(۸) مدرّس اور بحث و اطّلاع

ٹریننگ کالج سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک مدرّس یہ سمجھ لیتا ہے کہ

اب اس کی تعلیمی زندگی کا دَور ختم ہو گیا۔ حالانکہ اُسے جاننا چاہیئے۔ کہ علم کی کوئی آخری حد ہے ہی نہیں۔ بلکہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد ہی طالب علم کا اصل زمانہ شروع ہوتا ہے۔ مدرسہ تو صرف راستہ کھول دیتا ہے اب رہبری خود آپ کا کام ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ علم اور معلومات کے حصول میں ہمیشہ آدمی لگا رہے تاکہ فکر کا دروازہ بند نہ ہو۔ علم و اطلاع، بحث و تجربہ اور خبر و نظر کی طرف گام فرسائی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے ؛

انگلستان کے مدرّس صرف اپنی کالج کی تعلیم، اور تجارب درسیہ پر اکتفا نہیں کرتے۔ سالانہ تعطیلات کے زمانہ میں ہر سال دو ہفتے، یا ایک مہینے کے لئے موسمِ بہار کے مدارس میں شرکت کر کے تعلیم و تربیت پر اہم لیکچر سُنتے، اور اپنے معلومات بڑھاتے رہتے ہیں۔ علم النفس میں مزید درک حاصل کرتے ہیں۔ اور غیر ملکی زبانوں کو سیکھ کر، ان کے لٹریچر سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کتنا اچھا ہو، اگر ہمارے دیس میں بھی اس طرح کے مدارس قائم ہوں۔ اور معلّمین کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کی جائے ؛

مدرّس اگر کتب خانوں، لائبریریوں اور عام لیکچروں سے استفادہ کا عادی ہو۔ اور مطالعۂ کتب جدیدہ کا خوگر ہو، تو بھی اُسے کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور اس فائدہ سے وہ اپنے طلبہ کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہنچا سکتا ہے ؛

(۹) مدرّس کی توجّہ

مدرّس کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے۔ کہ وہ مدرّس ہے۔ اسے منظم مرتّب اور مہذّب ہونا چاہیئے۔ بغیر اس کے وہ کامل مدرّس نہیں بن سکتا۔ اسے تعلیم پر قادر ہونا چاہیئے۔ اپنے ادارہ کا ایک بہتر انسان بننا چاہیئے۔ اپنے کام میں حکمت عملی کا خُوگر ہونا چاہیئے ٭

(۱۰) مدرّس اور رُوحِ جدید

تربیت و تعلیم کی جدید رُوح اور اصول سے بھی مدرّس کو پُورے طور پر واقف ہونا چاہیئے۔ مثلاً

(۱) طلبہ میں تعاون کی رُوح پیدا کرنا کہ وہ اپنے ساتھیوں اور اُستادوں سے تعاون کرسکیں ٭

(۲) تعلیم اور عمل میں ربط پیدا کرنا چاہیئے ٭

(۳) خواہ مخواہ زجر و توبیخ سے کام نہ لینا چاہیئے ٭

(۴) تلمیذ کو اعتمادِ نفس کے جذبہ سے آشنا کرنا چاہیئے ٭

(۵) شاگرد کو عمل کا شوق دلانا چاہیئے ٭

(۶) تلامذہ کی طبیعتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے ٭

(۷) بچّوں میں تعلیمِ نظری و تعلیمِ عملی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے انہیں عملی زندگی کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ تمام چیزوں سے پہلے اسی چیز پر غور کرنا چاہیئے ٭

(۱۱) مدرّس اور عزیمت

مدرّس کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ عزم و ارادہ کا پکّا ہو۔ اس میں توازن ہونا چاہیئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ایک دن تو کسی کام کا حکم دے۔ اور

دُوسرے دن بغیر خاص سبب کے اس سے منع کر دے۔

(۱۲) مدرّس اور تندرستی مدرّس کو ہر اعتبار سے توانا اور تندرست ہونا چاہیئے۔ اس کی قوّتِ سماعت اچھی ہو۔ اس کی آنکھیں کمزور نہ ہوں۔ اس کی آواز معتدل ہو۔ جسمی اور بدنی امراض سے وہ ملوّث نہ ہو۔ کیونکہ ضعیف الجسم مدرّس ارادہ کا کمزور اور خیال کا پست ہوتا ہے۔ سریع التاثیر اور ضعیف الاعصاب ہوتا ہے۔ اور امراض کا ہدف بنا رہتا ہے۔ وہ صحیح طور پر اپنے کام انجام نہیں دے سکتا۔

(۱۳) مدرّس کی شخصیت تمام ماہرینِ علم النفس و تربیت اس خیال پر متفق ہیں کہ "مدرسہ اور طلبہ کی ہر چیز، صرف مدرس کی شخصیت پر منحصر ہے!"

حقیقت یہ ہے کہ مدرّس کی شخصیت، بڑا اثر رکھتی ہے۔ وُہ طلبہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور مدرسہ پر بھی۔

خلاصۂ کلام مدرّس اور اس کے صفات و خصائص پر گزشتہ صفحات میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔ اب ہم خلاصۂ کلام کے طور پر اپنی کہی ہوئی باتوں کو بطور اجمال پیش کرتے ہیں :-

(۱) مدرّس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوی شخصیت کا بارعب شخص ہو۔ تاکہ وہ اپنے طلبہ پر چھا سکے۔

(۲) بچّوں سے محبت کرتا ہو، جیسی باپ اولاد سے

کرتا ہے ۔
(۳) بچّوں کی نفسیات سے واقف ہو ۔
(۴) یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ تعلیم فرد ہی کی تحسین کا نہیں سوسائٹی کی بہتری کا بھی ذریعہ ہے ۔
(۵) تمام طلبہ کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہو ۔ امیر و غریب میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتا ہو ۔
(۶) اپنے مقصد میں مخلص ہو ۔
(۷) زندگی اور دُنیا کے معاملات و مسائل سے اس کا قریبی رشتہ قائم ہو ۔ تاکہ وہ اپنے طلبہ کے سامنے کسی مسئلہ میں بند نہ ہو سکے ۔
(۸) علم سے غیر معمولی شغف رکھتا ہو ۔
(۹) فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہ نہ ہو ۔ سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی کرتا ہو ۔ لیکن اس کی سختی میں قساوت نہ ہو ۔ اور اس کی نرمی ضعف کے سبب نہ ہو ۔ حکمت عملی سے کام کرنے کا عادی ہو ۔
(۱۰) تربیتِ جدیدہ کے اصولوں سے واقف ہو ۔
(۱۱) عزم و ارادہ کا قوی ہو ۔
(۱۲) توانا اور تندرست ہو ۔
(۱۳) حاضر جواب ، صائب الرّائے ۔ وسیع النظر اور واضح الخیال ہو ۔
(۱۴) بُرے کاموں سے مجتنب رہتا ہو ۔ رکیک باتوں سے دُور رہتا ہو ۔ تاکہ احترام و اجلال کا سزاوار بن

جائے ۔

(۱۵) حلیم و بُردبار ہو۔ کشادہ قلب ہو، صبر و برداشت کی قوت رکھتا ہو۔ نفس و شعور کو ضبط و نظم کا خُوگر رکھ سکتا ہو۔ ذرا سی بات پر بھڑک نہ جاتا ہو معمولی باتوں سے متاثر نہ ہو جاتا ہو ۔

(۱۶) زبان پر پُوری قدرت رکھتا ہو۔ تاکہ اپنے خیال کی صفائی کے ساتھ وضاحت کرسکتا ہو۔ اور اپنا مفہوم اچھی طرح سمجھ سکتا ہو ۔

(۱۷) طلبہ کو خود کام کرنے کا اہل بنانے کا جذبہ رکھتا ہو۔ ان کی صرف اسی وقت مدد کرتا ہو، جب وہ خود طالبِ امداد ہوں ۔

روز، اسباق کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟" ڈاکٹر آرنلڈ نے وہ جواب دیا۔ جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا "میں چاہتا ہوں، میرے شاگرد ہر روز نئے چشمہ کا تازہ پانی پئیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ سڑا اور رُکا ہوا پانی پئیں!" ان الفاظ سے ڈاکٹر آرنلڈ کا مطلب یہ تھا کہ ہر روز سبق کی تیاری سے نئے نئے شگوفے کھلیں تاکہ درس میں حیات و نشاط پیدا ہو۔ موت اور جمود کی کارفرمائی نہ ہو۔ تاکہ اسباق کا زندگی سے سررشتہ قائم رہے۔ منقطع نہ ہونے پائے۔ جمود اور فساد سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔

انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ جس طرح ایک عام آدمی بھولتا، چوکتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک مدرس بھی بھول چوک سکتا ہے۔ لیکن اگر ہر روز وہ اپنے نصاب کا مطالعہ، اور اس کے درس کی تیاری کرتا رہے۔ تو نہ صرف یہ کہ اس سے غلطی کا احتمال نہیں رہتا، بلکہ اس کی تعلیم اور زیادہ قوت حاصل کر لیتی ہے۔

لہ Dr. Thomas Arnold Head Masters of Rugby School.

رگبی، انگلستان کی تعلیم گاہوں میں بہت اہم درس گاہ ہے۔ ڈاکٹر آرنلڈ ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۴۲ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مدرّس کو صرف درس کی تیاری اور مطالعہ ہی پر اکتفا نہیں کر لینا چاہیئے۔ اسے یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ وہ اپنا علم، اپنے طلبہ کے سامنے کس انداز اور اسلوب سے پیش کرے کہ ان کے دل میں بات بیٹھ جائے۔ اور وہ پورے طور پر اس کا مفہوم سمجھ لیں؟

مدرّس کو اس پر بھی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ جو کچھ کتاب میں ہے، وہ اس کے ذہن و حافظہ پر نقش ہے۔ اور وہ اپنے طلبہ کے سامنے طوطے کی طرح جاکر سارا سبق رٹ لے گا۔ یہ طریقہ نہ اخلاص پر مبنی ہے نہ دیانت و امانت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

علم اور تعلیم یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ علم حاصل کرنے کا زمانہ تعلیمی دور اور نصاب ختم کر لینے کے بعد ہی آتا ہے۔ علم میں اضافہ بحث و تکرار ہی سے ہوتا ہے۔ وہ علم جسے کوئی نہ سُنے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائے۔ وہ سوا نقص و نسیان کے کچھ پیدا نہیں کرسکتا۔ ایک ماہرِ تعلیم کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم کو بابرکت بناتا ہے۔ اس لئے بابرکت بناتا ہے کہ وہ علم سیکھتا اور اسے قبول کرتا ہے۔ ایک یہودی ماہر تربیت و تعلیم کا بیان ہے کہ: "میں نے اپنے اُستادوں سے بہت کچھ سیکھا لیکن اپنے ساتھیوں سے اُستادوں سے بھی زیادہ سیکھا۔ اور اپنے شاگردوں سے سب سے

زیادہ سیکھا !" سچ پوچھیے تو اس قول میں ذرا بھی غرابت نہیں ہے۔ ایک ذہین طالب علم کبھی کبھی ایسے نکتے تک پہنچ جاتا ہے جہاں تک اُستاد کی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ سرگرم اور شوقین طلبہ اپنے عمل سے اُستاد میں بھی علمی سرگرمی کا جذبہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ خود بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اُستاد کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں ؛

ایک طالب علم، درس کی جو تیّاری کرتا ہے۔ مدرّس کی تیّاری اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ طالب علم کی تیّاری محدود اور سطحی ہوتی ہے وہ صرف اپنے درس کی تیاری کرتا ہے۔ وہ بھی معمولی طور پر، لیکن مدرّس اس طرح نہیں کر سکتا۔ اسے عمیق نظر سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور درس کے متفرّقات اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ تاکہ وہ جو علم پیش کرے وہ اس سے زیادہ ہو جو طلبہ نے بطورِ خود اپنے مطالعہ اور تیّاری سے حاصل کر لیا ہے ؛

درس کی تیّاری کے وقت مدرّس کو ان کلمات اور الفاظ کے معنی بھی یاد رکھنے چاہئیں جو سخت ہوں۔ وہ عبارت کے ہر فقرہ اور جملہ کا مفہوم اچھّی طرح سمجھتا ہو، اور سمجھا سکتا ہو۔ وہ منطق اور سنجیدہ فکر و ترکیب کی وضاحت کرنے پر قادر ہو۔ ہر قال کی آسان انداز میں تعبیر کر سکتا ہو۔ وہ ضرورت

کے مطابق درس میں حذف و اضافہ سے بھی کام لے سکتا ہو ؛

چند مبادیات

درس کی تیاری کے سلسلہ میں، معلم کو مبادیاتِ ذیل کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے :-

۱- مدرّس کو، صرف آج کے درس ہی پر نظر نہیں رکھنا چاہیئے - بلکہ کل جو پڑھا چکا ہے - اور کل جو پڑھائے گا، اس پر بھی اس کی نظر ہونی چاہیئے ؛

۲- سالِ تعلیم کے شروع ہی میں مدرّس کو اپنا پورا سال بھر کا پروگرام اور نصاب اپنی نظر کے سامنے رکھ لینا چاہیئے - ہر ہر سبق کا ایک اصول معیّن کر لے - کس طرح پڑھائے گا؟ کن مسائل پر زیادہ زور دے گا ؟ کن مسائل پر یونہی سرسری گزر جائے گا ؟ پیچیدہ عبارتوں کی توضیح کس طرح کرے گا ؟ مشکل الفاظ کے معنی کس طرح بتائے گا ؟ عبارت اور اسلوب میں تطبیق کیوں کر کرے گا ؟

۳- مدرّس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں سے ہر ایک کی ذہنی، دماغی اور جسمی اہلیت پیشِ نظر رکھے - غبی اور ذہین کو پہچانتا ہو - یہ سمجھتا ہو کہ ایک ہی درس کا یہ حصّہ وہ فلاں طالب علم کو کس طرح سمجھائے گا، اور فلاں تلمیذ

کے کس طرح ذہن نشین کرے گا؟

۴۔ اُن وسائل سے بھی مدرّس کو مسلّح ہونا چاہیئے، جن سے کام لے کر وہ آسانی کے ساتھ، اپنے طلبا کو اپنا مفہوم ذہن نشین کرا سکتا ہے۔ یا جن سے درس کی توضیح میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً تصویریں، مثالیں، نمونے وغیرہ ٭

۵۔ سابق طلبہ کے معلومات سے بھی، مدرّس کو فائدہ اُٹھانا چاہیئے، تاکہ قدیم و جدید کا ربط قائم رہے۔

۶۔ مدرّس کو اپنے کورس کے انتخاب میں حسنِ انتخاب سے کام لینا چاہیئے۔ جو اس کے اور تلامیذ کے فہم و ذوق سے پُوری پُوری مطابقت رکھتا ہو ٭

۷۔ مختلف اسباق کے درمیان مشابہت اور اختلاف کی جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں، مدرّس کی ان کے اسباب و وجوہ پر بھی نظر ہونی چاہیئے۔ اسی توضیح و تشریح پر نقطۂ درس کی وضاحت کا انحصار ہوتا ہے ٭

۸۔ مدرّس کو اپنے کورس پر پُوری طرح غالب اور متصرّف ہونا چاہیئے ٭

۹۔ درس کی تحدید و تعیین بھی مدرّس کو پیشِ نظر رکھنی چاہیئے ٭

۱۰۔ مدرسہ کی لائبریری پر بھی مدرّس کی وسیع نظر ہونی چاہیئے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے۔ اس کے کورس

سے متعلق کون کون سی کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ تاکہ بوقتِ ضرورت، وہ اپنے طلبہ کو ان کتب کی مراجعت پر آمادہ کرسکے۔ اور درس کے بعد وہ ان سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

۱۱۔ اسباق کا زندگی سے، اور زندگی کے حالات و مسائل سے پُورا رشتہ قائم رہنا چاہیئے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران میں مدرّس بڑی آسانی سے طلبہ کو وطنیت کا درس بھی دے سکتا ہے۔ اور انتخابی زندگی کے پہلو بھی ان کے سامنے آجاگر کرسکتا ہے۔ یا اگر جنگ کا زمانہ ہو تو وہ اپنے طلبہ کو بموں سے بچنے، اور ذاتی و اجتماعی حفاظت کے گُر بھی بتا سکتا ہے۔ اور ان کا جذبۂ مدافعتِ وطن قوی سے قوی تر کرسکتا ہے۔

۱۲۔ مدرّس کو یہ پہلے سے سوچ لینا چاہیئے کہ وُہ اپنا درس کس انداز و اسلوب پر شروع کرے گا۔

تیّاری کے فوائد

صفحاتِ بالا میں، ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ مدرّس کے لئے اپنے درس کی تیاری کتنی ضروری اور اہم ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس تیّاری سے کیسے اچھّے اور بیش بہا فائدے حاصل ہوتے ہیں:۔

۱۔ اگر مدرّس اپنے نصاب پر حاوی ہے۔ اور درس پُوری تیاری کے ساتھ دیتا ہے۔ تو اپنے درجہ کو ضبط و نظم کا خُوگر بنانے میں اسے ذرا بھی دُشواری

پیش نہیں آئے گی ۔ طلبہ اگر مدرّس کو درس میں کمزور پاتے ہیں ۔تب ہی وہ اسے خیال میں نہیں لاتے ۔ اور درجہ کا ضبط و نظم درہم برہم کر دیتے ہیں ۔ ورنہ نہیں ۔ اگر مدرّس اپنے فن میں کامل ہے ۔ اور درس کی پُوری تیاری کرکے درجہ میں آتا ہے ۔تو بغیر تعزیر و عقوبت کے طلبہ اس سے ڈریں گے ۔ اور اس کے اشارے پر چلیں گے ۔ شریر لڑکوں کو شرارت سے روکنے کے لئے اس کی ایک نظر کافی ہے ؂

۲۔ اگر مدرّس اپنے طلبہ کی مقدارِ فہم سے واقف ہے ، اور وہ اپنی تیاری سے فائدہ اُٹھا کر انہیں پُورا فائدہ پہنچاتا ہے ، تو وہ تلامذہ کے درمیان اس طرح بیٹھے گا۔ جیسے مُریدوں کے مجمع میں پیر ۔ وہ حوصلہ افزائی بھی کرے گا ، اور غافل کو ہُشیاری کا درس بھی دے گا۔ ضعیف کی مدد کرے گا ۔ اور کاہل کو آمادۂ عمل کرے گا؂

۳۔ اگر مدرّس ہر وقت درس کے لئے تیار رہے ۔اور اس کی تیاری مکمّل ہے ۔ تو طلبہ اس سے محبّت کریں گے۔ اور وہ اخلاصِ عمل کی ایک بہترین مثال بن جائے گا؂ باگلے[1] کا قول ہے : "معلّم کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہر سبق کی مکمّل تیاری کرلے تب درجہ میں جائے " یہ قول بالکل واقعیت پر مبنی ہے ۔ اس اصول پر عمل کرنے کے بعد کوئی دُشواری بھی باقی نہیں رہ جاتی ؂

---

[1] ملاحظہ ہو :- The Educative Process, by Baoley.

تدریس کے بنیادی قواعد

اب ہم تدریس و تعلیم کے چند بنیادی اور اہم قواعد و ضوابط پیش کرنا چاہتے ہیں :۔

ایک خاص بات

اس جگہ یہ بات ہم صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم مدرس کو کوئی حکم دے کر اسے کسی خاص وضع و اسلوب کی حد میں جکڑنا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ ہر انسان کا خود اپنا ایک طرز و اسلوب ہوتا ہے۔ اور اس میں مداخلت مناسب نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں۔ کہ ہر درس کا ایک خاص اصول اور ضابطہ ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کچھ قوانینِ عامہ بھی اس سلسلہ میں موجود ہیں۔ اور ان سے استفادہ بہر حال ضروری ہے۔ ہم ان لوگوں میں بھی نہیں ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ماضی میں ماہرینِ تربیت و تعلیم نے جو اصول و قواعد مرتب کئے تھے، وہ تمام کے تمام رائگاں اور بیکار ہیں۔ کام کی باتیں ان میں بھی مل سکتی ہیں اور ان سے بھی ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں جو قواعد مرتب اور منضبط ہو چکے ہیں۔ وہ بھی حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتے۔

ان میں کچھ ایسے ہیں جو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھے جا چکے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو زیرِ تجربہ ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی خطا و صواب کا ابھی اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ اور ایسے قواعد بھی ہیں جو تا آن منضبط نہیں کئے جا سکے ہیں ؛

اب ذیل میں ہم چند ایسے اصول درج کرتے ہیں، جو ہر کورس، اور درس میں فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں :-

(۱) غرض کی تحدید

مدرّس کے سامنے درس دیتے وقت ایک خاص غرض ہونی چاہیئے جس کا اصول سرگرمیٔ کار کا محرّک ہو۔ اور یہ غرض و مقصد، تلمیذ کے سامنے بھی ہمیشہ رہنا چاہیئے تاکہ وہ صحیح معنی میں معلّم سے تعاون کر سکے۔ اور اس معیّن غرض کے حصول کی جد و جہد کر سکے۔ اگر ایک مخصوص مقصد پیشِ نظر نہیں ہوگا، تو نہ مدرّس کامیاب ہوگا، نہ تلمیذ کے اندر لگن اور اُمنگ پیدا ہوگی ؛

(۲) ایک اور اصول

مدرّس کا فرض ہے کہ وہ اپنے درس کا کام خوبی کے ساتھ شروع کرے۔ منطقی ترتیب پیشِ نظر رکھے اور ان اصولوں کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے جنہیں دورانِ درس میں وہ بروئے کار لائے گا۔ طلبہ کی ایسی تقسیم کرے کہ کمزور طلبہ ایک طرف، ذہین ایک طرف۔ لیکن یہ

تفتیم اس طرح ہو کہ خود طلبہ اسے محسوس نہ کرسکیں ورنہ ذہین طالب علم اپنی ذہانت پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے گا۔ اور کمزور میں بے حوصلگی پیدا ہوجائے گی ؎

(۳) قانونِ ربط

مدرّس کو قانونِ ربط سے بھی پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ یعنی اسے جدید معلومات کو قدیم معلومات و تجارب سے مربوط اور مسلسل رکھنا چاہیئے۔ اگر مدرّس نے اس اصول کو نظر انداز کر دیا، تو وہ اپنے مقصد میں مشکل سے کامیاب ہوسکے گا ؎

مدرّس کو بچّہ کے احوال و افکار کی رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو :-

امریکہ کے ایک مدرسہ میں، ایک اُستانی نے ایک لڑکے کو کتاب کے کچھ شعر پڑھنے کی ہدایت کی۔ ان اشعار میں لڑکا ایک بڑھئی سے کہتا ہے "یہ درخت نہ کاٹ" اور اس درخواست کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ "اس کے سایہ میں ہم بھائی بہن کھیلا کرتے تھے۔ یہیں میری ماں مجھے پیار کیا کرتی تھی۔" لڑکے نے یہ اشعار پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور خاموش بیٹھ گیا اُستانی نے اسے مجبور کیا کہ وہ پڑھے۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں مجبوراً پڑھنے لگا۔ پھر گر پڑا۔ اور رونے لگا۔ اُستانی گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا

کہ یہ ماجرا کیا ہے ؟ یہاں تک کہ اسے ایک دُوسرے طالب علم نے بتایا کہ اس لڑکے کی ماں ابھی حال میں مری ہے ۔ اگر اُستانی کو اپنے شاگرد کا یہ حال معلوم ہوتا، تو وہ ضرور اس کے احساس و شعور کی رعایت رکھتی اور اسے ایسی تکلیف نہ دیتی، جو بے مقصد تھی ۔

(۴) قانونِ انتباہ تدریس کے بنیادی اصول و ضوابط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طالب علم میں تشویق پیدا کی جائے ۔ تاکہ وہ درس کی طرف پُورے طور سے متوجہ ہوسکے ۔ اپنے وقت سے فائدہ اُٹھائے اور اپنے افکار میں تازگی پیدا کرے ۔ تشویق سے طالب علم کے شعور اور انتباہ میں اضافہ ہوتا ہے ۔ اور پختگی پیدا ہوتی ہے ۔ اگر طالب علم کی انتباہی قوت کمزور ہو تو مدرّس اسے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتا ۔ اگر وہ سختی اور درشتی سے کام لے گا ۔ تو اس سے بھی کچھ زیادہ کام نہیں چلے گا ۔ درجہ اُتار دے تو بھی بے نتیجہ ۔ یاد رہے ۔ شوق و جبر میں بہت فرق ہے ۔ طالب علم اگر شوقین ہے تو وہ بہت کچھ حاصل کرلے گا ۔ اور اگر اسے مجبور کیا جائے تو وہ کچھ بھی نہیں حاصل کرسکے گا ۔

طالب علم میں اگر تشویق و انتباہ کا جذبہ بیدار کردیا جائے ۔ تو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے ۔ اور وہ لڑکا جو درس سے کوسوں بھاگتا ہے ۔ اور علم سے نفرت کرتا ہے ۔ بڑا محنتی اور شوقین بن جاتا ہے ۔

لیکن ہر حالت میں اُستاد کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ رغبت اور شوق دونوں سود مند ہیں۔ لیکن شوق فطری اور طبعی چیز ہے، اور رغبت خارجی چیز۔ شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور رغبت پیدا کی جاتی ہے۔

(۵) ادراک و حواس سے استفادہ

علمائے علم النفس کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عقل اسی چیز کو قبول کرتی ہے جو حواس میں پہلے سے موجود ہو۔ لہٰذا حواس کی تربیت در اصل عقل کی تربیت ہے۔ مشہور انگریزی شاعر ملٹن[1] نے اسے اگر "معرفۃ خمسہ" کا دروازہ قرار دیا ہے تو ذرا بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ ماہرینِ تعلیم و تربیت، حواس کی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ پیمانے، اوزان، موسیقی، نقاشی، کتابت، جغرافیہ اور دستی اشغال میں، حواس کا بہت بڑا درجہ ہے۔ بلکہ بغیر حواس کی تربیت کے یہ فنون حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔ ہاتھ اور حواس بچّہ کے معلّمِ اوّل یہی ہیں۔ روسو کہتا ہے "ہمارے ہاتھ، پاؤں، آنکھ۔ یہی چیزیں ہیں جو ہمیں فلسفہ سکھاتی ہیں!" پستالوزی، فردبل اور اسپنسر نے بھی تربیت

---

[1] جان ملٹن Jhon Milton انگلستان کا یگانۂ روزگار شاعر ۱۶۰۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۷۴ء میں وفات ہوئی۔ اسے شیکسپیئر کی صف میں رکھا جاتا ہے۔

حواس پر بہت زیادہ زور دیا ہے ۔

سچ پوچھئے تو حواس عقل کی کنجی ہے ۔ حواس اگر درست ہیں تو انسان کی عقل بھی مکمل ہے ۔ مدرس کا کام یہ ہے کہ وہ ان روشندانوں کو کھول دے ۔ جو براہ راست عقل سے تعلّق رکھتے ہیں ۔ روسو نے جو رہنمائی کی ہے ، اسی کو پیشِ نظر رکھ کر تعلیم و تربیت کے نئے نئے حلقے (مانتسوری سسٹم وغیرہ) عالمِ وجود میں آئے ہیں ۔ ایک اور موقع پر روسو نے کہا ہے " حواس کی تربیت کا مقصد ان کا مجرّد استعمال نہیں ہے " یعنی دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ تربیتِ حواس کا مقصد ہے ، معرفت تک پہنچنا ، صحیح حکم لگانا ، قوتِ شعور کو بیدار کرنا ، ادراک و نظر کی قوّت پیدا کرنا ۔

(۶) افکار کی تعبیر

افکار ہی سے اعمال پیدا ہوتے ہیں اگر تلامذہ کے نفوس میں فکرِ صحیح پیدا ہوچکی ہے ۔ تو خیال اور جذبہ کی تعبیر و تفسیر وہ بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ کرسکتے ہیں ۔ اسی طرح نقش و تصویر ، عمل و اشارہ کی پرکھ بھی ان میں بدرجۂ اولیٰ پیدا ہوسکتی ہے ۔ اگر وہ یادداشت کی تحریروں کی ، تصویروں کی ، نقوش کی ، کام کی صحیح تعبیر کرنے پر قادر ہیں ۔ تو مقصد حاصل ہوگیا ۔ اس لئے کہ تعبیر صحیح ہی ان کے نفوس میں فکرِ صحیح پیدا کرسکتی ہے ۔

اِن باتوں سے یہ واضح ہوگیا کہ طلبہ کو جو نقّاشی اور

مصوّری وغیرہ سکھائی جاتی ہے۔ اس کی اصل غرض وغایت یہ نہیں ہوتی۔ کہ انہیں بہت بڑا نقاش یا مصوّر، یا فن کار بنا دیا جائے۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ پیش آمدہ افکار کی صحیح تعبیر و وضاحت کرسکیں ؛

(۷) نشاطِ ذاتی تلمیذ کو، کافی وقت خالی رہنا چاہئے، جسے وہ نشاط و سرگرمی کے ساتھ اپنے ذاتی تجارب کے سلسلہ میں صرف کرسکے۔ بار بار مشق کرے اور کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے۔ مشق، مہارتِ عمل کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ بچّہ کے اعضا بھی مشق ہی سے بڑھتے اور نمو حاصل کرتے ہیں۔ بغیر مشق کے وہ ضعیف اور شکست پڑ جاتے ہیں۔ اگر تلمیذ اپنے نفس پر اعتماد کرے۔ اور تفکیر کو فروغ دے تو اس کی عملی قوّت لامحالہ بڑھ جائے گی ؛

بچّوں میں نشاط اور چُستی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی کوئی حدو نہایت نہیں ہوتی۔ وہ فطرتاً حرکت اور عمل کو پسند کرتے ہیں۔ سکون اور کسل سے نفرت کرتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی صحت اچھی ہے۔ ضروری ہے کہ بچّوں میں نشاط اور چستی کو بروئے کار لانے کی پُوری جدّ و جہد کی جائے۔ اور انہیں موقع دیا جائے کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھائیں ؛

روسو کہتا ہے کہ تعلّم میں اعتمادِ نفس، ابتکار اور اختراع کا موجب بنتا ہے۔ بچّہ میں کسی کاپی سے نقل کرنے کی عادت نہیں پڑنی چاہئے۔ بلکہ اس میں

خود فکر و عمل کی اسپرٹ ہونی چاہیئے ۔ مدرّس کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے ۔ کہ تعلیم کثرتِ تکلم کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مدرّس کی رہنمائی میں خود طلبہ اپنے ذہن و فکر کی مدد سے گتھیاں حل کریں ۔ اور اپنا کام بلا مدد غیرے کرنے کی عادت ڈالیں ۔ انہیں مدد صرف اُس وقت دی جائے جب وہ حقیقتاً اس کے محتاج ہوں

(۸) قانون استقرا و استنباط

چھوٹے بچوں کے لئے طریقۂ استقرائی بہت موزوں اور مناسب ہوتا ہے ۔ اس طرح کہ مدرّس جزئیات سے کلیات تک مثالیں دیتا ہوا رفتہ رفتہ پہنچے ۔ ساتھ ہی ساتھ تجارب تعریف اور قاعدہ و حکم کی مزاولت بھی رہے ۔ طلبہ کو اختلاف و اعتراض کی پُوری اجازت ہونی چاہیئے ۔ تاکہ وہ خود استنباط و استخراج کرکے مقصود بالذات قاعدہ تک رسائی حاصل کرسکیں ۔

بڑے طلبہ کے لئے قیاسی طریقہ زیادہ مفید، اور مناسب ہوتا ہے ۔ اس طرح انہیں قاعدہ یاد ہو جاتا ہے ۔ اور وہ تطبیق اور امثلہ سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے ۔ لیکن یہ بڑی غلطی ہوگی ۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ہر کورس اور نصاب، استقرا و استنباط سے کام لے کر مکمل کرایا جا سکتا ہے بعض ایسے اسباق بھی ہیں جو استقرا کے قطعاً محتاج نہیں ہیں ۔ جیسے نقاشی، مصوری، موسیقی

وغیرہ - یہ صرف مشاہدہ اور تجربہ کے محتاج ہوتے ہیں ٭

بچّہ کا استقرا مکمل نہیں ہوتا - نہ قوانینِ عامہ کا ادراک مکمل ہوتا ہے - شروع میں اس کا ادراک بالکل ناقص ہوتا ہے - رفتہ رفتہ آرا اور تجارب کے ساتھ ادراک تکمیل پاتا ہے - اور استقرا مکمل ہو جاتا ہے - اور حاصل شدہ آرا و افکار و نظریات سے انتفاعِ کامل ممکن ہو جاتا ہے - استقرا سے ہم حقائقِ عامہ تک پہنچتے ہیں - قیاس سے توضیح کا کام لیتے ہیں - برہان سے تصحیح کرتے ہیں - یہاں تک کہ وہ مسئلہ تلامیذ کے اذہان میں رچ جاتا ہے ٭

قانونِ قیاس

جب تلامیذ، قاعدۂ عامہ سے طریقِ استقرائیہ کے سہارے واقف ہو جائیں - تو اس کی توضیح اور اذہان میں تثبیت، طریقۂ قیاسیہ کی مدد سے ممکن ہے - استقرا کا مقصد ہے - افکار، تعریفات احکام اور قواعدِ عامہ کی مدد سے عقل میں اضافہ - اور قیاس کا مقصد ہے - افکار، تعریضات، احکام اور قواعدِ عملیہ سے پُورا پُورا انتفاع - نیز ان دونوں کے درمیان تطبیق - تاکہ تلامذہ کے ذہن و دماغ میں وہ بات اچھی طرح جم جائے ٭

اطفال جب یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے جو قواعد نظریات حاصل کئے ہیں - ان سے انتفاع پر وہ پُورے

طور پر قادر ہیں۔ تو بہت مسرور ہوتے ہیں ٭
ایک مثال سُنئے دو ڈھائی سال کے ایک بچّہ نے پنجرے میں ایک چیتا دیکھا۔ تالیاں بجا کر باپ سے کہنے لگا " ابا، ابا، دیکھنا کتنی بڑی بلّی!" اس کی یہ فکر طریقۂ قیاسیہ کا نتیجہ تھی کہ چیتے کو بلّی پر قیاس کر لیا۔ اس لئے کہ ان دونوں میں کافی مشابہت ہوتی ہے مدرس کا فرض ہے۔ کہ بچّہ کے اس میل اور رجحان کو ترقی دے۔ یہاں تک کہ بچّہ کے آرا اور تجارب مکمّل ہو جائیں۔ ان میں کوئی نقص باقی نہ رہ جائے ٭

کسب معلومات کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ ذہن کو معلومات کا خزانہ بنا دیا جائے۔ یہ ہے کہ تلمیذ پڑھنے لکھنے میں، اور اپنے عمل میں ان سے پورا اور صحیح فائدہ اُٹھا سکے۔ یہاں تک کہ عامل، عالم اور کامل ماہر بن جائے۔ جس علم سے عمل کا فائدہ نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں، وہ بیکار مرض ہے ٭

امریکہ کے مشہور ماہر علم النفس و تربیت جان ڈیوی کا قول ہے۔ " تربیت کا مقصد، زندگی کے لئے تیّاری کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تربیت بجائے خود زندگی ہے!"

علم و عمل میں کافی فرق ہے۔ اور ایک دوسرے میں تناقض بھی ہے۔ ہم بہت سی چیزیں جانتے ہیں۔ لیکن عملاً ان سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں۔ جن کا نتیجہ ہیں نہیں معلوم۔ جن کی افادیت سے ہم بے بہرہ ہیں۔ اور یاد

رکھنا چاہئے ۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا عیب یہی ہے کسی شخص کا اخلاق جانچنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ روز مرّہ کی زندگی میں اس کے اعمال کا کیا حال ہے ؟ اگر وہ اس کے اقوال سے ہم آہنگ ہیں ۔ تو وہ اچھا ہے ۔ اور اگر اقوال و اعمال میں فرق ہے ۔ تو وہ منافق ہے ۔ جو کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں جو کچھ کرتے ہیں وہ کہتے نہیں ۔ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں ۔

قانونِ عادت

تدریس کے بنیادی قوانین میں، قانون عادت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے عادت سے مراد ہے، تکوینِ عادت ۔ یعنی ایسی عادت پیدا کرنا کہ وہ عمل بن جائے ۔ مدرسہ تکوین عادات میں ہرگز تن تنہا کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ جب مدرسین اور معلمین بھی اس باب میں اس سے پُورا پُورا تعاون نہ کریں ۔

عِلم اور عمل

عِلم اور عمل میں چُولی دامن کا ساتھ ہے ۔ ایک دُوسرے سے الگ ہوا اور بیکار ہوا ۔ بیسویں صدی کے جدید قواعدِ تربیت و تعلیم اسی اصول پر مبنی ہیں ۔ یہ وہ اصول ہے جس کی طرف روسو بہت پہلے اشارہ کر چکا ہے ۔

اس اصول کا مبدا یہ ہے کہ تلمیذ کو اعتمادِ نفس کا عادی بنا دیا جائے کہ وہ خود اپنے عمل سے عِلم، اور عِلم سے عمل حاصل کرے ۔ انسان کو افکار و آراء

میں دُوسروں کا غلام نہیں ہونا چاہیئے۔ حقیقت کی معرفت، اور حقیقت تک پہنچنے میں خود اپنی عقل سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ اپنی قوتِ فکریہ کو معطّل نہیں کر دینا چاہیئے۔ بلکہ اس سے کام لینا چاہیئے ؛

تلمیذ اور اُستاد

اُستاد کو شاگرد کے ساتھ رہنا چاہیئے"! یہ بڑی پُرانی حقیقت ہے۔ اور جدید اصولِ تربیت بھی اس کی اہمیت پُورے طور پر محسوس کرتا ہے۔ فردبل نے بہت عرصہ پہلے یہی بات کہی تھی۔ اور آج کے ماہرینِ علم النفس و تربیت بھی یہی کہہ رہے ہیں

ڈاکٹر برٹرینڈ رسل کا قول ہے : "معلّم اس وقت تک معلّم نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کھیت میں اپنے شاگرد کے ساتھ گائے کا دودھ دوہنے پر تیار نہ ہو۔ جب تک وہ اس کے ساتھ رہتا نہ ہو۔ جب تک وہ اس کی سوسائٹی کا ایک فرد نہ ہو۔ جب تک وہ اس کی فطرت، اور نفسیت سے واقف نہ ہو۔ جب تک وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اسے کیا مرغوب ہے اور کیا نامرغوب بغیر اس کے وہ اسے پُورا پُورا فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ نہ اس کی فکر کو اونچا کرسکتا ہے۔ نہ اس کے عمل و علم میں اضافہ کر سکتا ہے۔ نہ اُسے آئندہ زندگی کے لئے تیار کرسکتا ہے ؛

مدرسہ کا مقصد

بچّے مدرسے کیوں بھیجے جائے

ہیں ؟

اس لئے نہیں کہ وہ زندگی کے لئے تیاری کریں اس لئے اور صرف اس لئے کہ زندہ رہیں ، اور زندہ رہ سکیں ۔ کل فردبل نے یہی بات کہی تھی اور آج جان ڈیوی صاحب یہی فرما رہے ہیں۔ جان ڈیوی کا قول ہے :

"تربیت زندگی کی تیاری کا نام نہیں ہے
بلکہ وہ خود مستقل زندگی ہے"

لہٰذا ہم مدرّس سے توقع کرتے ہیں کہ اس کے اسباق زندگی بخش ہوں گے ۔ یہ اسباق زندگی سے متصل ہوں گے ۔ وہ انہیں زندگی کے لئے بعد میں تیار کرے گا ۔ پہلے ان میں زندگی کی رمق پیدا کرے گا ۔ مدرسہ کے اندر بھی ، اور باہر بھی ۔

بچّہ کی فطرت

مدرّس کے لئے یہ بھی بسا ضروری ہے ۔ کہ وہ بچّہ کی فطرت میلانات و رجحانات اور امیال و عواطف سے پُورے طور پر واقف ہو ۔ اور ہمہ وقت ان پر نظر رکھے ۔ فردبل اور روسو نے اس اصول پر بہت زور دیا ہے ۔

مختصر اسباق

درس کی طوالت فائدہ کے بجائے نقصان کی موجب ہوتی ہے ۔ بالخصوص جب کہ تلمیذ کم عمر اور ناسمجھ ہوں ۔ اس لئے کہ وہ زیادہ عرصے تک

ایک ہی نقطہ پر اپنی توجّہ مرکوز نہیں رکھ سکتے۔
اسباق اگر مختصر ہوں، اور ان میں کچھ تنوّع بھی
ہو۔ تو بچّے دلچسپی کے ساتھ آخر وقت تک بیٹھے
رہیں گے۔ اور پُورا پُورا فائدہ درس سے اُٹھائیں گے
ان میں عمل کی طرف رغبت پیدا ہوگی ؛

تدریس کے عام طریقے

اب ہم تدریس کے عام طریقوں پر گفتگو کریں گے۔

طریقِ تدریس اور اس کی اہمیت

درس کے سلسلے میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ طلبہ کو سبق دیا کیونکر جائے؟ اسی پر مدرّس کی کامیابی، اور طلبہ کی کامرانی اور مدرسہ کی نیک نامی کا انحصار ہے۔ سوچنے کی چیز یہ ہے۔ کہ ہم کون سا طریقہ اختیار کریں کہ جو سبق چاہیں وہ گھول کر طلبہ کو پلا دیں۔ اور جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ ان کے ذہن و دماغ میں رچ اور بس جائے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قبل اس کے کہ معلّم اپنے کلاس میں داخل ہو۔ اسے اپنے ذہن میں دینے والے سبق کا ایک نقشہ تیار کر لینا چاہیئے کہ مجھے یہ پڑھانا ہے۔ اور اس طرح پڑھانا ہے۔ پھر کلاس میں جا کر اپنے طے شدہ پروگرام پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔ طریقِ تدریس یا تعلیم پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ نتیجہ کی اچھائی اور برائی کا تمام تر اسی پر مدار ہوتا ہے۔ صرف مدرسہ ہی کا نہیں۔ مدرّس کی کامیابی اور ناکامی بھی اسی چیز پر منحصر ہوتی ہے۔ بہت

سے ایسے معلّم ہوتے ہیں کہ اپنے فن میں یکتا ہوتے ہیں - لیکن طریقِ تدریس سے ناواقف ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے علم سے وہ اپنے تلامذہ کو خاطرخواہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے - وہ ایسا اسلوب اور طرز نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں وہ براہِ راست طلبہ کے ذہن و عقل کو متاثر کرے ؛

مدرّس کا فرض ہے کہ سب سے زیادہ جس چیز پر وہ زور دے وہ یہی طریقۂ تدریس ہے - تاکہ وہ بھی نیک نام اور سُرخ رو ہو اور اس کے طلبہ بھی کامیاب و کامگار ہوں - اور مدرّس کی شہرت پر بھی حرف نہ آئے - جس طرح ہم مدرّس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے فن میں ماہر ہوگا - اسی طرح ہم اس سے یہ امید بھی رکھتے ہیں - کہ وہ طریقِ تدریس کا عالم ہوگا - اور اپنے طلبہ کو گمراہ نہ ہونے دے گا ؛

تدریس کے شروط

قبل اس کے کہ ہم تدریس کے طریقوں کی اصل اور تہ تک پہنچیں ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہ ہونے دیں کہ ہمیں طفل کی نفسیات اور عقل کا جائزہ لینے کا طریقہ بھی معلوم ہونا چاہیئے - جب تک ہم بچّہ کی نفسیت اور عقلیت سے پُورے طور پر واقف نہیں ہوں گے ، ہرگز اس کے کام نہیں آسکتے - نہ اُسے فائدہ پہنچا سکتے ہیں - ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کس طرح کام کرتا ہے - کیونکر سوچتا ہے ؟ محسوس

کس طرح کرتا ہے؟ تصوّر کس طرح قائم کرتا ہے؟ خیال و ادراک کی دُنیا میں کیونکر پہنچتا ہے؟ اور وہاں کیا کرتا ہے؟ یادداشت کا کیا عالم ہے؟ اور سہو و نسیان کی کیا کیفیت ہے؟ جب تک یہ بنیادی چیزیں ہمیں نہ معلوم ہوں، ہم کوئی صحیح اور کارگر طریق تدریس وضع نہیں کرسکتے۔ اور نہ کامیاب طور پر اُسے بروئے کار لا سکتے ہیں ٭

قدیم اسلوب قدیم طریقہ بالکل لغو اور مہمل تھا۔ مدرّس اسی طرح پڑھاتا تھا۔ جس طرح خود اس نے پڑھا تھا۔ یا جس طرح اسے پڑھایا گیا تھا۔ اُس زمانہ میں ساری توجہ نصاب اور کورس پر مبذول رہتی تھی۔ صرف نصاب اور کورس کی طرف۔ کسی اور طرف بالکل نہیں۔ لیکن عصرِ جدید میں بلا شبہ نصاب اور کورس کی طرف بھی توجہ کی جاتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ خود طفل، اس کی جبلّت، اور نفسیت پر بھی توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ قدیم و جدید کا یہی فرق ہے۔ اور بہت بڑا فرق ہے۔ اگر ہم بچہ کی نفسیت اور عقلیت سے واقف نہ ہوں، تو ہرگز صحیح طرز پر اسے درس نہیں دے سکتے۔ صرف اسی طرح وہ اپنے نصاب کو ہضم کرسکتا ہے۔ اور درس کی طرف راغب اور مائل ہو سکتا ہے اور اس کے ذوق و شوق سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ٭

قدیم طرزِ تدریس میں ایک اور بھی بہت بڑی

تہذیب و تمدن ایک چولا بدل رہی ہے۔ انسانیت ایک نئی اور انوکھی منزل کی طرف جادہ پیما ہے۔ انسان انسان کے قریب آ رہا ہے۔ اور اور دنیا ایک خاندان میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس عظیم خاندان کے مختلف افراد کی ذہنی پیچیدگیوں کا تجزیہ کرنے کے لئے

شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لئے

تحلیلِ نفسی

پڑھئے

مصنفہ :- حزب اللہ ایم۔ اے

یہ کتاب آپ کو معاشرت کی نئی تعمیر میں مدد دے گا۔ اور نئے سماجی خاکوں میں رنگ بھرنے کے لئے ذہنی طور پر آراستہ کرے گی۔ اس کتاب کے آئینہ میں آپ انسانوں کی بنتی بگڑتی، سنورتی اور بدلتی ہوئی شخصیت کا عکس عمل کی تجربہ گاہ میں دیکھیں گے اور آپ کو اس کی رفعتوں، پستیوں، اُلجھنوں اور کمینگیوں پر پیار آنے لگے گا۔ انسانوں کے لئے کوئی مطالعہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا دلچسپ مطالعہ انسانوں کا مطالعہ ہے۔

کتاب مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل :-

(۱) لاشعور (۲) خواہشات اور قوت نفسی (۳) ارتقائے شہوانیت (۴) جنسی تہیجات و مقاصد کا حشر (۵) آبائی اُلجھاؤ (۶) نرگسیت (۷) خواب (۸) وضعی بیماریاں (۹) تحلیلِ نفسی کی تکنیک (۱۰) جبری اعصابی خلل۔

ناول سے زیادہ دلچسپ۔ ڈرامہ سے زیادہ ہمہ گیر۔ اُردو زبان میں اپنے موضوع کی پہلی اعلیٰ کتاب۔ خوبصورت گرد پوس۔ مضبوط مجلد قیمت آٹھ روپے :

کتاب منزل۔ کشمیری بازار لاہور